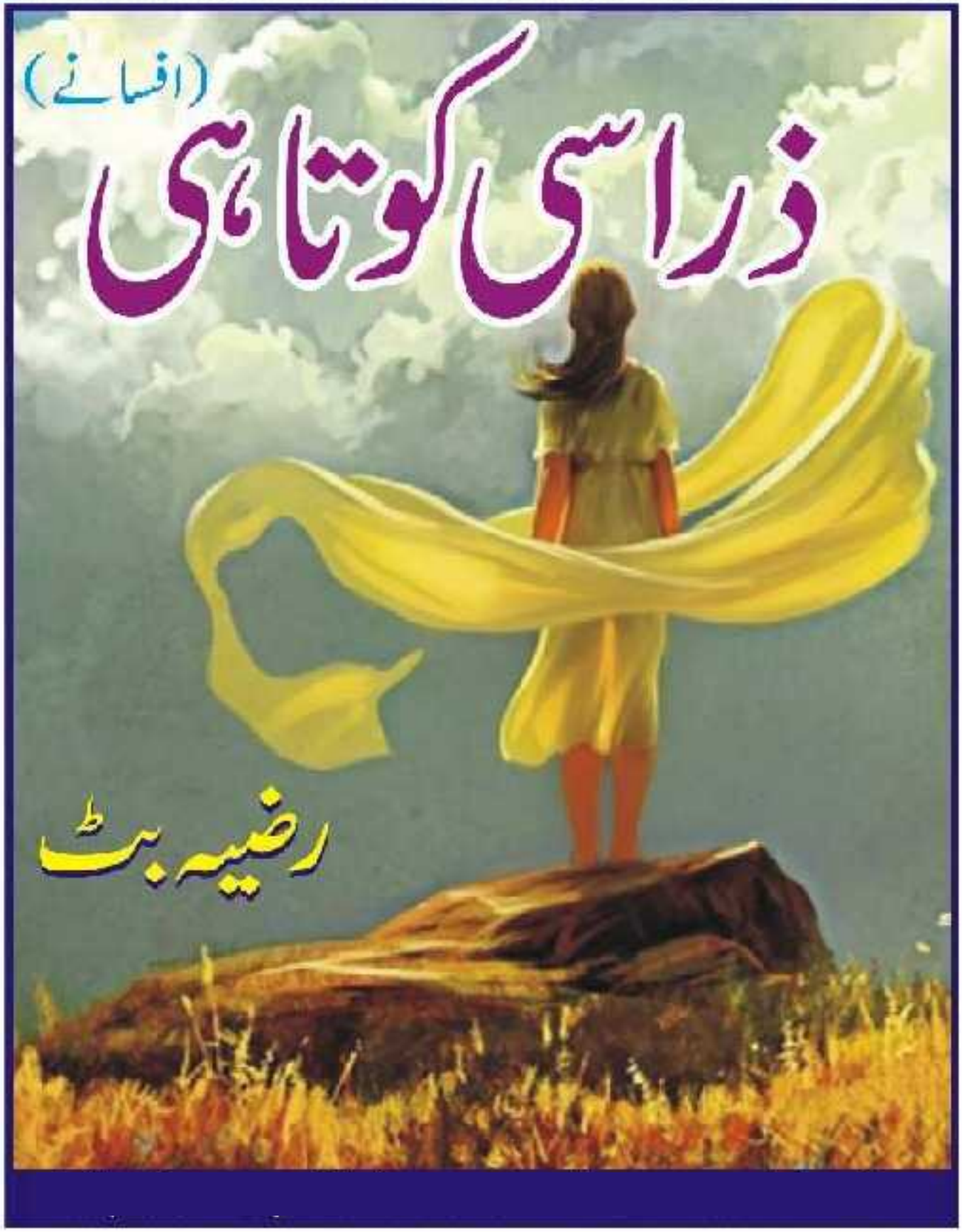

(افسانے)
ذرا سی کوتاہی
رضیہ بٹ

ذرا سی کوتاہی

(افسانے)

رضیہ بٹ

سبق

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سٹول پر بیٹھی وہ اپنے سیاہی مائل جوگیا لباس کی ہم رنگ لپ اسٹک ہونٹوں پر لگا رہی تھی۔ کپڑوں کا سا شیڈ بنانے میں اسے کافی وقت لگا۔ اس کے لیے پنسل اور لپ اسٹک استعمال کرنا پڑی۔ شیڈ من پسند بن گیا تو اس نے آخری ٹچ دیتے ہوئے بیضوی آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ اہتمام سے تیار ہونا اس کی عادت تھی اور آج تو اہتمام اس لیے بھی تھا کہ وہ اپنے دیور حماد کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہی تھی۔ حماد تین سال پہلے انجینئر بنا تھا اور اب اسے ایک معقول جاب مل گئی تھی۔ اس لیے گھر والے اس کا رشتہ کسی اچھی جگہ کرنے کے خواہاں تھے۔ حماد کی امی نے لڑکی دیکھی تھی۔ پسند بھی کر لی تھی' گھر بار اور لوگ بھی انہیں پسند تھے۔

لیکن

حماد کو امی سے زیادہ سنعہ بھابی کی پسند پر اعتماد تھا۔ اسی لیے اس نے بھابی کو بطور خاص کراچی سے بلایا تھا۔ ان دنوں عماد اور سنعہ کراچی میں تھے۔ دونوں بچوں نے سکول جانا شروع کر دیا تھا' آنا مشکل تھا پھر بھی وہ حماد کے اصرار پر آ گئی تھی۔

''بھابی! آپ کی پسند میری پسند ہوگی۔'' حماد نے اس سے کہا تھا۔

''امی نے جو لڑکی پسند کی ہے وہی میری پسند ہوگی۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

''یہ ضروری نہیں بھابی۔۔۔۔۔۔۔ جہاں آپ پسند کریں گی رشتہ وہی ہوگا۔''

''دیکھو بھئی۔۔۔۔۔۔۔''

''جی''

''امی تمہارے لیے رشتہ دیکھ چکی ہیں' انہیں پسند بھی ہے۔ گھر بار بھی اچھا ہے لوگ بھی مخلص ہیں۔ پھر باقی کیا رہ گیا؟''

''باقی رہ گیا آپ کا پسند فرمانا۔'' اگر آپ کو یہ لوگ اور خصوصاً وہ محترمہ پسند آ گئیں تو آپ کو میری طرف سے اختیار حاصل ہے بھابی' وہیں ہاں کر آئیے گا۔۔۔۔۔۔۔ بے شک شادی کی تاریخ بھی مقرر کر آئیے گا۔''

''بڑے تیز ہو۔۔۔۔۔۔۔ شادی ابھی نہیں ہوگی۔''

''کیوں؟''

''بچوں کو چھٹیاں ہوں گی تب پروگرام بنے گا' ویسے آج میں ہاں ضرور کر آؤں گی۔''

''دیکھے بغیر ہی کہہ رہی ہیں۔''

''دیکھو حماد۔۔۔۔۔۔۔ مجھے گھر گھر جا کر لڑکیاں دیکھنا' پسند ناپسند کے خانوں میں بانٹنا بالکل پسند نہیں۔ تم نہیں جانتے یہ ہمارے معاشرے کی کتنی خراب رسم ہے۔ لڑکیوں کو بالکل بکاؤ مال سمجھا جاتا ہے۔ منڈی میں رکھا جنس کا ڈھیر۔ جس پر خریدار چاہے تو بولی دے' چاہے تو ناپسند کر کے آگے بڑھ جائے۔ ان لڑکیوں کے ذہن و قلب کی حالت کا اندازہ تو کرو جنہیں لڑکے والے دیکھنے جاتے ہیں اور ناپسند کر آتے ہیں۔ ان کے ماں باپ کے جذبات و احساسات کے متعلق سوچو ذرا۔''

''لیکن بھابی! رشتہ بنا دیکھے بھالے بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ ساری عمر کا سوال ہوتا ہے۔ لڑکے کی پسند کا بھی کوئی معیار ہوتا ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو' اس کے لیے کوئی اور طریقہ بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ لڑکی کو احساس دلائے بغیر کہیں دیکھ لیا جائے کم از کم اس کے جذبات تو مجروح نہ ہو ریجیکٹ ہونے کی صورت میں۔''

''تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔''

''اب دیکھو نا' ماریہ کو امی دیکھ چکی ہیں' پسند کر چکی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ماریہ اور اس کے والدین کو ان کے رویے سے امید ہو چکی ہے کہ رشتہ طے ہو جائے گا۔ اب اگر میں تمہارے معیار کا پیمانہ لے کر جاؤں اور پاس ماریا پوری نہ اترے تو۔۔۔۔۔۔۔''

لیکن بھابی' آپ کو میری پسند کا پتہ ہے اور یہ رشتہ طے کرتے وقت آپ کو پوری ایمانداری سے اس پسند کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''ہو سکتا ہے وہ ویسی ہی ہو جیسی تم چاہتے ہو۔ آخر امی نے دیکھی ہے امی کو بھی تمہاری پسند کا پتہ ہے۔''

''اوہ بھابی! امی کی پسند کے میزان پرانے ہو چکے ہیں۔'' حماد ہنس کر بولا تو سعدیہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''انہی پرانے میزانوں پر مجھے بھی تو ناپا تولا گیا تھا' کیا میں اچھی نہیں ہوں؟''

''آپ۔۔۔۔۔۔۔ آپ جتنی اچھی ہیں اتنی ہی اچھی لڑکی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے' میں خیال رکھوں گی۔ پہلے ان کے ہاں جا تو لوں۔''

آج سعدیہ ماریا کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اسے ماریا کے جذبات و احساسات کا پوری طرح اندازہ تھا۔ اس کے امی ابو کی ذہنی اور دلی حالت سے بخوبی آگہی تھی گو وہ ان سے پہلے ملی نہیں تھی۔''

لیکن

ماریا کا مسئلہ

اس معاشرے کی ہر لڑکی کا مسئلہ تھا۔

وہ

خود بھی تو اس اذیت دہ اور رسوا کن مرحلے سے کئی بار گزری تھی۔

وہ ایک سفید پوش گھرانے کی لڑکی تھی۔ دو چھوٹے بھائی اور بیوہ ماں کے ساتھ چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان دنوں وہ تھرڈ ائیر میں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔باپ کا چھوڑا ہوا اتنا اثاثہ ضرور تھا کہ گزر بسر کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑا تھا۔ امی سلیقہ شعار عورت تھی' بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے تھے' اس لیے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتی رہتی تھی۔ جہیز کی چھوٹی موٹی چیزیں بھی تیار کرتی رہتی تھی۔

سنعہ نے بی اے کیا تو امی کو رشتے کی فکر ہوئی۔ ملنے جلنے والوں سے کہا' رشتہ داروں سے بات کی۔

لیکن

بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کرنا آسان نہ تھا۔

بیٹی حسین نہ تھی' پس منظر میں بھی دولت کی جگمگاہٹ نہ تھی اس لیے رشتے کا حصول آسان نہیں تھا۔ دو ایک رشتے کسی نے بتائے لیکن امی کو پسند نہ آئے۔ لڑکوں کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی اور سنعہ بی اے کر چکی تھی۔ کاروبار بھی ایسے نہیں تھے کہ تعلیم کی خامی کو نظر انداز کیا جا سکتا۔

امی اب خاصی متفکر رہنے لگی تھی۔

اپنے عزیزوں میں بھی رشتے موجود تھے۔ عالیہ بھابی کا بیٹا انجینئر بن گیا تھا۔ چچا زاد صولت کا بیٹا ایم بی اے کر رہا تھا۔ تائی حمیدہ کا بھتیجا ایک پرائیویٹ کمپنی میں خاصی معقول تنخواہ پہ ملازم تھا۔

لیکن اپنوں میں کسی نے بھی رشتہ نہیں پوچھا تھا۔ لگتا تھا کسی کو سنعہ نظر ہی نہیں آتی۔ عالیہ کے بیٹے نعیم نے کچھ دلچسپی ظاہر کی تھی لیکن اماں نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی روک دیا تھا۔ اپنے انجینئر بیٹے کے لیے تو اس نے بڑے اونچے اونچے خواب پرورکھے تھے۔ وہ بھلا ایک یتیم بچی کو بہو کیسے بنا لیتی۔

سنعہ کو یہ سب کچھ بہت برا لگا تھا۔ اس نے امی سے دبی زبان میں کہہ بھی دیا تھا۔ ''امی اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھیں۔ اور ایسے لوگوں

کے پیچھے نہ دوڑیں جو خود سرپٹ بھاگ رہے ہیں۔"

امی ٹھنڈی گہری آہ بھر کر کہتیں۔ "ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ دوڑ دھوپ تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے۔ ہمارے وقتوں میں لڑکے والوں کے جوتے گھس جاتے تھے رشتہ ڈھونڈتے ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اب تو لڑکی والوں کو در در کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔"

"امی ۔۔۔۔۔۔۔ آپ اس تلاش میں اپنے آپ کو اتنا گرائیں نہیں۔ جس نے آنا ہوگا آ جائے گا۔ نہ آیا تو کوئی بات نہیں۔" امی مایوس ہو کر اس کا منہ تکنے لگتی۔

پھر

ایک دن اس کی کزن یہ نوید لے کر آئی کہ کچھ لوگ سنعہ کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ "لڑکا ایس ڈی او ہے' گھر اپنا ہے' تین بہن بھائی ہیں' خاندان اچھا ہے۔"

امی نے اس سے کہا اور بھی تفصیلات بتائیں۔ امی خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ خود اسے بھی خوشی اور تفاخر کا احساس ہوا۔ دبا دبا کر رکھے جذبوں کی پھلجڑیاں من میں خود بخود پھوٹنے لگیں۔ آنکھوں میں خواب جھلملانے لگے اور ان دیکھے جیون ساتھی کی قربتوں کی مہک سے سرشاری کی کیفیت سراپا پر چھانے لگی۔

ماں بیٹی نے گھر صاف کیا' پرانے صوفے پر نئے غلاف ڈالے' تپائیوں پر کڑھائی والے رومال بچھائے۔ میٹل پیس پر رکھے پیتل کے گلدانوں کو مانجھ مانجھ کر چمکایا۔ ان میں مصنوعی آرائشی پھول لگائے۔ پردے دھو کر لگائے۔ ڈیوڑھی کا اینٹوں والا فرش دھو دھو کر سرخ کر دیا۔

امی نے چائے کے لیے بھی خاصا اہتمام کیا۔ کیک پیسٹریاں سموسے رس گلے جانے کیا کچھ منگوا لیا۔

لڑکے کی ماں بہن اور خالہ اسے دیکھنے آئیں۔

وہ چائے کی ٹرے لے کر بیٹھک میں گئی۔ اس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا' گھبراہٹ طاری تھی۔ برتن میز پر رکھتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آنے والی تینوں عورتوں کی نظروں کے زاویے اس کی طرف تھے۔ تینوں جانچ پرکھ رہی تھیں اور ایک دوسری کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہی تھیں۔ یقیناً انہیں وہ پسند آ گئی تھی۔ کھا پی کر وہ چلی گئیں۔ کچھ کہا نہیں' بتایا نہیں' جواب نہیں دیا۔

امی اور خود وہ کئی دن ان کی طرف سے آنے والے پیغام کا انتظار کرتی رہیں۔

کئی دنوں بعد امی اپنی کزن سے ملی تو اس سے پوچھا۔ ''ان لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔''

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''جواب دے دیا ہے' میرا ہی حوصلہ نہیں پڑتا تھا تمہیں بتانے کو۔ لڑکی تو انہیں اچھی لگی ہے پر گھر بار ۔۔۔۔۔۔۔ وہ کسی امیر گھرانے کی تلاش میں ہیں۔''

اس کا دل ڈوب گیا۔

اور

خود اس پر جو بیتی وہ ۔۔۔۔۔۔۔ وہی جانتی تھی۔ ایک چھناکے سے سارے نازک نازک کانچ ایسے سپنے ٹوٹ گئے اور ان کی کرچیاں احساسات کے سینے میں چبھ گئیں۔ اس نے بہت اثر لیا۔ اپنی کم مائیگی کے احساس سے وہ دکھی ہو گئی۔

پھر مہینے گزر گئے۔

امی فکر مند ہوتی ہیں۔

انہی دنوں ایک اور رشتہ آیا۔ یہ لوگ اچھی اور شریف لڑکی کے خواہاں تھے۔ جہیز کے متعلق انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا دیا ان کے پاس بہت کچھ ہے۔

امی کی آس ایک بار پھر بندھی۔ پورا یقین ہوا کہ یہاں رشتہ طے ہو جائے گا۔

جس دن ان لوگوں نے اسے دیکھنے آنا تھا' بڑا گہما گہمی کا دن تھا۔ سارے گھر کی صفائی کی گئی' بیٹھک صاف ستھری کی گئی تھی۔ صوفوں کے کپڑے دھلائے گئے تھے۔ گلدانوں میں پھول سجائے گئے تھے۔ دیواروں پر تصویری فریم آویزاں کئے گئے تھے۔ امی نے سعدیہ کو بھی بطور خاص تیار ہونے کو کہا تھا اس نے نیا جوڑا پہنا تھا' ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا تھا اور بال بھی سلیقے سے سجائے تھے۔

امی نے ان لوگوں کے آنے سے پہلے کئی بار ناقدانہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔ وہ اسے سجا بنا کر ان کے سامنے پیش کرنا چاہتی تھیں۔

''کانوں میں بندے پہن لو۔''

''دوپٹہ اس طرح اوڑھو۔''

''بال ذرا ڈھنگ سے تو بناؤ۔''

''گالوں پر روژ لگالو۔''

''ذرا چہرہ ہشاش بشاش ہونا چاہیے۔''

''تھوڑا مسکرانا بھی' مسکراہٹ بذات خود خوبصورتی ہے۔''

امی اسے خوبصورتی کے معیار پر پرکھ رہی تھی۔ اور شاید وہ اس پر پوری نہیں اتر رہی تھی۔ امی کو ناامیدی اندر ہی اندر خطرے کی گھنٹی بجا بجا کر پریشان کر رہی تھی۔

یہ لوگ بھی آئے۔

اور

چلے گئے۔

سنعہ حسن کے معیار پر پوری نہ اتری تھی۔ یہ ایسا دھچکا تھا کہ سنعہ کو لگا وہ منتشر ہو کر رہ گئی ہے۔

پھر

اس طرح کئی رشتے آئے۔ امی نے ہر بار اسے سجا بنا کر آنے والوں کے سامنے پیش کیا' لیکن بات کہیں نہ بنی۔ اب تو سنعہ کو رشتے کے نام ہی سے چڑ ہونے لگی تھی۔ امی کسی آنے والے کی بات کرتیں تو وہ بھڑک اٹھتی' پٹاخ سے جواب دیتی۔ ''آنا ہے تو آئیں' نہ میں تیار ہوں گی نہ ان کے سامنے جاؤں گی۔''

پریشان حال امی اور پریشان ہو جاتی۔

سنعہ کو بی اے کئے دوسرا سال جا رہا تھا۔ رشتے کی بات کہیں بھی بنتی نظر نہ آتی تھی۔ پریشان جھنجھلاہٹوں نے اس پر بہت اثر کیا تھا۔ چہرے پر جوانی کی چمک کی آخری رمق بھی مٹتی جا رہی تھی۔ رنگ گورا تو تھا نہیں' اب تو اور بھی گہرا سانولا ہوتا جا رہا تھا۔ شگفتگی نام کو نہ رہی تھی۔ مزاج میں بھی بڑی واضح تبدیلی آ گئی تھی۔ رشتے کی بات تو سن کر کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ کوئی رشتہ آتا امی بہ منت کہتیں۔ ''تیار ہو کر آ جاؤ' فلاں کپڑے پہن لو' تھوڑا میک اپ بھی کر لو۔'' تو وہ غصے میں بھر کر کہتی۔ ''امی مجھے سجا بنا کر کسی چوراہے پر کھڑا کر دو۔ کوئی پسند کر ہی لے شاید۔۔۔۔۔۔۔ لوگوں کو گھر بلا بلا کر خرچہ بھی کرتی اور کوفت بھی سہتی ہو۔''

اس کا دل ٹکڑے ہو جاتا' آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور جب وہ ان آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتی تو سنعہ کا دل کٹ کٹ جاتا۔

شب و روز گزرتے چلے جا رہے تھے۔ سنعہ کے ہاتھ پیلے کرنے کی تمنا امی کے دل میں سلگ رہی تھی۔ کوئی چارہ نظر نہیں آتا تھا۔

یہ بات نہیں تھی کہ رشتے آئے نہیں تھے۔۔۔۔۔۔۔آئے تھے لیکن رسوائی اور اذیت کے سوا ہاتھ کچھ نہ آتا تھا۔کس کو گھر پسند نہ آتا کسی کو لڑکی' کوئی ایسے ہی چپ سادھ لیتا' جواب دینے کی تکلیف بھی گوارہ نہ کرتا۔

پھر

مایوسی کے اندھیروں میں کرن چمکی۔سعدہ کے ابو کے دوست کی وساطت سے رشتہ آیا۔صاحب حیثیت لوگ تھے۔لڑکا ایم اے تھا اور پی ڈبلیو ڈی میں سپروائزر تھا۔

حسب معمول امی گھر کی صفائی میں لگ گئی۔چائے کے لوازمات اکٹھے کئے۔سعدہ نے نیا جوڑا پہننے کو کہا۔

''نہیں پہنوں گی' پسند کرنا ہے تو انہی کپڑوں میں کریں۔''

''بیٹی۔۔۔۔۔۔۔کیوں ستاتی ہے؟''

''میں ستاتی ہوں یا آپ؟''

''چل بحث نہیں کر میری اچھی بچی تیار ہو جا' اچھے گھر سے مہمان آرہے ہیں۔''

سعدہ طنز سے ہنسی اور بولی۔''کھیر کی پلیٹ ہوں نا میں چاندی کے ورق اور پستے کی ہوائیاں چھڑک کر مہمانوں کو پیش کرنا ہے مجھے۔''

''سعدہ!''

''بس کہہ دیا ہے اسی طرح رہوں گی میں۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے امی کے اصرار کے باوجود کپڑے نہیں بدلے۔نہ ہی چہرہ سنوارا اور نہ ہی بالوں کو ترتیب سے گندھا۔

اور

حیرانی کی بات وہ اسی حلئے میں ان لوگوں کو پسند آ گئی۔

یہ پہلا رشتہ تھا جنہوں نے اسی روز اپنی رضامندی یوں ظاہر کی کہ سعدہ کی امی کو بھی اپنے ہاں مدعو کیا۔

امی کی خوشی دیدنی تھی۔اس غبارے کی طرح پھولی جا رہی تھیں' جس میں ضرورت سے زیادہ ہوا بھر دی جاتی ہے۔اپنی بیکراں خوشی کا اظہار انہوں نے سعدہ کو لپٹا کر کیا' پیشانی چومی' دعائیں دیں۔

خوش سعدہ بھی کچھ کم نہیں ہوئی۔اسے تو رتی بھر امید نہ تھی کہ اسے کوئی قبول کر لے گا۔سعدہ کی آنکھوں میں پھر سے رنگین و حسین

خواب جاگ اٹھے۔ان کا پرتو اس کے چہرے پر بھی پڑنے لگا۔دنوں ہی میں اس کا رنگ وروپ نکھر آیا۔سانولی سلونی سعدیہ اتنی پر کشش و پیاری لگنے لگی کہ دیکھنے والی حیران ہو جاتے۔

بات چلی

بات بڑھی

رشتہ طے ہو گیا

منگنی کی رسم معمولی طور پر اس لیے کی گئی کہ ان لوگوں کو شادی جلدی کرنا تھی۔امی نے بھی اسے غنیمت جانا۔فضول کا خرچہ ہی تھا جس سے بچ گئیں۔سعدیہ اور امی دونوں ہی خوش تھیں۔

''خرچہ بچ گیا۔''

''شادی پر ایک ہی دفعہ ساری خوشیاں منالیں گے۔''

''منگنی کی رسم ضروری تھوڑا ہی تھا۔''

''اعلان ہی مقصود ہونا تھا وہ ہو ہی گیا۔''

''شادی کی تاریخ پکی کرنا ہے ساری رسمیں تب ہی ہو جائیں گی۔''

''انگوٹھی وہ بھی پہنا گئے۔۔۔۔۔۔۔انگوٹھی ہم نے بھی پہنا دی۔''

''یہی کافی ہے' یہی اچھا ہے۔۔۔۔۔۔۔دونوں پیسے کے ضیاع سے بچ گئے۔''

ماں بیٹی ایسی ایسی باتیں کر کے' سوچ کے خوش ہوتیں۔

شادی کی تیاریاں انہوں نے شروع کر دیں۔امی نے جمع پونجی کا حساب کیا' کپڑا تھا جو اکٹھا کر کے رکھا تھا وہ نکالا' اپنی شادی کا جو بچا کھچا زیور تھا وہ بیچ کر نیا سیٹ خریدا۔چھوٹی موٹی چیزیں جو خرید خرید کر رکھی تھیں ترتیب سے رکھیں۔جو خریدنا تھیں اس کی فہرست بنائی۔بارات کے کھانے کا خرچہ کا حساب لگایا۔درمیانی سی شادی کرنے کے لیے بھی ہزاروں روپوں کی ضرورت تھی۔کچھ قرضہ لینا پڑتا تھا۔پھر بھی دونوں خوش تھیں۔یہ مرحلہ طے کرنا ہی تھا۔

شادی کی تاریخ پکی کرنے لڑکے کی ماں اور خالہ آئیں۔

امی نے منہ میٹھا کرایا۔خوشی میں دونوں کو ریشمی جوڑے دیئے۔شگن کے طور پر یہ تحائف دیئے۔امی کی خوشی دیدنی تھی۔

لیکن

یہ خوشی دیر پا نہیں تھا۔ چمکتا دمکتا سورج گہنا گیا۔ سپنے بکھر گئے' خواب ٹوٹ گئے۔

شادی سے چند دن پہلے لڑکے والوں کی طرف سے مطالبے کی ایک فہرست آئی۔ جس میں گھر کی ہر چیز کے علاوہ لڑکے کے لیے سکوٹر کا مطالبہ بھی تھا۔ ساتھ ہی بارات کا ریسپشن کسی اونچے ہوٹل میں دینے کی بات بھی کی گئی تھی کیونکہ بارات کے ساتھ اہل ثروت اور اونچے لوگ آنے والے تھے۔

امی کا تو دماغ ہی چکرا گیا۔

سنعہ کے حواس پر جیسے بجلی گری۔ سبکی' رسوائی اور تذلیل کے خوف سے پیلی پڑ گئیں۔ امی بھاگی بھاگی ان کے ہاں گئیں۔

''ہم اس قابل نہیں ہیں' بن باپ کے بچی ہے۔۔۔۔۔۔۔ سفید پوشی کا بھرم بھی مشکل سے قائم رکھے ہیں۔ اتنا کچھ دینے کی ہم میں ہمت نہیں۔ خدا کے لیے ہماری عزت سے نہ کھیلئے۔ شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ سب لوگوں کو پتہ چل چکا ہے۔ یہ مطالبے کم از کم شادی کی تاریخ پکی کرنے سے پہلے کر دیتے۔ اتنی رسوائی اور جگ ہنسائی تو نہ ہوتی۔''

امی کے رونے دھونے' منت سماجت کرنے اور جھولی پھیلا پھیلا کر رحم کی بھیک مانگنے پر بھی کچھ نہیں بنا۔ وہ لوگ اپنی بات پر اڑے رہے۔ اس نے معتبر لوگوں کو بیچ میں ڈالا۔۔۔۔۔۔۔ انصاف کی دہائی دی۔

لیکن

بے سود

رشتہ توڑ دیا گیا۔

لڑکے والوں نے اگلے ہی مہینے کسی مالدار گھرانے میں بات طے کر لی۔ جہاں سے انہیں مطالبہ کئے بغیر ہی من مانا جہیز مل گیا۔

اور ظلم کی اس انتہا پر نہ آسمان ٹوٹا نہ زمین پھٹی۔

ہاں ماں بیٹی پر قیامتیں گزر گئیں۔

سنعہ تو ماں کا سامنا بھی نہ کر پاتی۔ اسے لگتا جیسے وہ ماں کی مجرم ہے' نہ وہ ہوتی نہ ماں کو اتنے دکھ سہنے پڑتے۔ امی بھی کچھ ایسے ہی جذبوں سے دوچار تھی۔ سنعہ کی صورت اس سے دیکھی نہ جاتی۔ دونوں ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر روتیں۔ اب تو رشتے یا شادی کا نام لیتے بھی دونوں کو خوف آتا تھا۔

''امی!'' ایک دن سعدیہ نے ماں سے کہا۔

''ہوں''

''میں کہیں نوکری کرلوں؟''

امی کا دل خون ہوگیا' آنکھیں دھندلا گئیں' سعدیہ کی بات کا جواب نہیں دیا۔

''کوئی ہرج نہیں امی! گھر بیٹھے بیٹھے اکتا گئی ہوں۔ کوشش کروں تو کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی۔ پیسہ بھی ملے گا اور وقت بھی گزرے گا۔ یوں تو۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ماں کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس ادھوری بات سے اس کے دل پر برچھیاں چل گئی تھیں۔

سعدیہ نے نوکری کے لیے دوڑ دھوپ شروع کردی۔ اس کی کچھ سہیلیاں اثر ورسوخ والے باپوں کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی وساطت سے کام بن سکتا تھا۔

اس دن بھی وہ اپنی دوست راشدہ کے ہاں اس سلسلے میں گئی ہوئی تھی۔

اور

وہیں اسے حماد کی امی نے دیکھا۔ پرکھ کی آنکھ سے زیادہ باطن میں جھانکتی ہے۔ سادہ سی لڑکی حماد کی امی کے من کو بھا گئی۔ تقدیر مہربان ہوگئی۔ شاید مظلوموں کے گھاؤ دیکھ کر اسے رحم آ گیا تھا۔ سعدیہ کے واپس جانے کے بعد حماد کی امی نے راشدہ سے اس کے متعلق پوچھا۔ اور جب اسے اس کے حالات کا علم ہوا تو اسے بہو بنانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ شرافت سے زیادہ بڑی دولت اس کی نظر میں کوئی نہیں تھی۔

حماد کی امی راشدہ کی امی کو لے کر چند دنوں بعد ان کے ہاں گئی اور عرض مدعا کی۔

امی بیچاری بوکھلائی ہوئی تھی۔ رشتے کی بات پر کوئی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ گلوگیر لہجے میں بولیں۔ ''میں بیوہ عورت ہوں' یتیم بچی کو لمبا چوڑا جہیز نہیں دے سکتی۔ آپ اپنے لائق فائق بیٹے کے لیے صحیح جگہ پہ نہیں آئیں۔''

حماد کی امی نے اٹھ کر سعدیہ کو گلے سے لگالیا۔

''بہن! جو اپنے جگر گوشے دوسرے کے حوالے کردیتا ہے اس کا احسان نہیں چکایا جاسکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہمیں صرف اپنی بچی کا ہاتھ دے دیں۔ میرا بیٹا ماشاءاللہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔ اچھا کماتا ہے۔ پوری زندگی پڑی ہے۔ قدم قدم ہی آگے بڑھا جاتا

ہے نا۔ میں تو کیا میرے بچے جہیز کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ سب سے بڑا جہیز جو ماں اپنی بچی کو دیتی ہے وہ تعلیم ہے' اچھی تربیت ہے' اخلاق و کردار ہے۔ اور میں نے اس بچی میں ان اوصاف کو پایا ہے۔''

امی بے یقینی سے اس کا منہ تک رہی تھی۔

وہ امی کو ہمت دلاتی رہیں' حوصلہ بڑھاتیں رہیں۔

انہوں نے جو کچھ کہا' وہی کر دکھایا۔

سنعہ کو حماد کی شریک حیات بنا دیا۔

شادی ہوگئی۔ امی نے اپنی خوشی سے جو ہو سکتا تھا کیا۔ حماد یا اس کی امی کی طرف سے کوئی فرمائش نہیں آئی۔ انہوں نے تو جہاں تک ممکن ہو سکا۔ خرچہ کم کروانے کی کوشش کی۔ بارات میں بھی تھوڑے سے لوگوں کو لائے۔ حالانکہ ولیمہ انہوں نے بڑے اہتمام اور بڑی شان سے کیا تھا۔

وہ جیسے نظر آتے تھے اس سے بھی کہیں زیادہ اچھے ثابت ہوئے۔ حماد نے سنعہ کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ ساس نے بھی ماں کی طرح پیار کیا۔ اسے اتنی محبت اور اہمیت ملی کہ اس کی دبی ہوئی شخصیت کے پرت کھلتے گئے۔ وہ بھی ان میں گھل مل گئی۔ پیار پایا اور پیار لوٹایا۔ حماد تو حماد چھوٹا دیور عماد بھی اس کی عزت اور احترام کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ بھابی سے پیار بھی بہت تھا۔ اس کی بات مانتا تھا۔ اس کی پسند و ناپسند پر اسے پورا اعتماد تھا۔

اسی لیے

تو

اب

جب امی نے اس کے لیے لڑکی تلاش کی تھی اس نے بھابی کو کراچی سے بطور خاص بلوا بھیجا تھا۔ اگر بھابی نے یہ رشتہ پسند کر لیا تو اسے وہاں سے شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ سنعہ تیار ہو رہی تھی۔

''جی امی''

''تیار ہو گئیں؟''

''جی بس آئی۔''

وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اوپر سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے زیر لب مسکرا دی۔ وہ اچھی خاصی سمارٹ اور حسین لگ رہی تھی۔

پتہ نہیں انسان کا چہرہ خدوخال اور رنگت سے حسین نظر آتا ہے یا اندرونی طمانیت' سکون اور خوشی کا پرتو اسے حسین دکھاتا ہے۔ سنعہ کے معاملے میں تو اندر والی بات ٹھیک لگتی تھی۔ حماد اور اس کے گھر والوں نے اس کے اندر کتنا اعتماد بھر دیا تھا۔ کتنی طمانیت بخشی تھی' ذہنی سکون دیا تھا۔

اس نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کی ساس تیار کھڑی تھی۔

''چلیں'' وہ بولی۔

''چلئے'' سنعہ نے کہا۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتی باہر آ گئیں' جہاں گاڑی کے قریب عماد کھڑا تھا۔

''تم بھی جاؤ گے ساتھ؟'' سنعہ نے ہنس کر مذاق کیا۔

''آپ جو جا رہی ہیں' میں سمجھتا ہوں میں ہی جا رہا ہوں۔''

''اوہو۔۔۔۔۔۔۔ اتنا اعتماد ہے مجھ پر۔''

''بالکل''

''تو بس آج معاملہ طے۔ میں نے تو امی سے بھی کہہ دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیوں امی؟''

اس کی ساس نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولی۔ ''خدا کرے میری پسند تمہیں بھی پسند آ جائے۔ ویسے تمہاری طرح مجھے بھی کبھی اچھا نہیں لگا کہ لڑکیوں کو جنس سمجھ کر ان کی بولی لگائی جائے۔ میری بیٹی تو کوئی نہیں پھر بھی مجھے دو بیٹیوں اور ان کے والدین کے جذبات کا پورا احساس ہے۔''

دونوں باتیں کرتی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

سنعہ نے پورا پورا ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ لڑکی کو شکل وصورت یا دولت کے پیمانے سے نہیں پرکھے گی۔ وہ اتنے تجربات سے اب تک خائف تھی۔ اسے معصوم اور مظلوم لڑکیوں سے بے پناہ ہمدردی تھی۔ وہ ان لڑکیوں کو لڑکیاں ہونے کے جرم کی سزا نہیں دینا چاہتی تھی۔ جو کچھ اس پر بیت چکا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی لڑکی پر بھی بیتے اور اس بات کا اظہار اس نے کھل کر اپنی ساس اور عماد سے بھی کر

رکھا تھا۔

دونوں جب لڑکی کے ہاں پہنچیں تو اہل خانہ نے ان کا یوں استقبال کیا جیسے ان سے معزز اور معتبر شخصیت دنیا میں ہے ہی نہیں۔

سنعہ کو اپنی امی یاد آ گئیں۔ وہ بھی کس طرح بچھ بچھ جایا کرتی تھیں۔ لڑکی کی بھابی انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد لڑکی کی بہنیں بھی آ گئیں اور اس کی امی بھی۔

سنعہ انہیں دیکھ کر چونک اٹھی۔ چہرے دیکھے بھالے تھے۔ انہیں پہچاننے میں اسے دیر نہیں لگی۔

اور

یہ

پہچان

سنعہ کو اندر سے ہلا گئی۔

یہ وہی لوگ تھے

وہی

جنہوں نے اس کا رشتہ اس لیے توڑ دیا تھا کہ اس کی غریب ماں ان کے مطالبات کی فہرست دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔ وہ یہ مطالبے پورے نہ کر سکتی تھی۔

دکھ اور غصے کی اک لہر سی اس کے اندر اٹھی۔

اس کی ساس ان سے باتیں کر رہی تھی' لڑکی کو بلوانے کا کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔اور سنعہ کے دل و دماغ میں طوفانی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

ان لوگوں نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ ایک تو اس بات کو چھ برس بیت چکے تھے' دوسرے سنعہ اب وہ سنعہ نہیں رہی تھی' نکھر کر شگفتہ پھول بن چکی تھی۔

پھر بھی

لڑکی کی ماں نے کہہ ہی دیا۔ ''لگتا ہے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔''

''ضرور دیکھا ہوگا۔'' سنعہ نے رکھائی سے کہا۔

''یاد نہیں پڑتا کہاں دیکھا تھا۔''

''کہیں تو دیکھا ہوگا' بازار میں' کسی کے گھر میں' ہوسکتا ہے ہمارے ہی گھر میں دیکھا ہو۔'' سعدیہ کے لہجے کی کاٹ پر اس کی ساس نے قدرے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

ماریا کی بھابی اسے لے آئی اس لیے سلسلہ گفتگو بدل گیا۔

ماریا قبول صورت لڑکی تھی۔ قدرے شرمائی اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی اماں کی گھبراہٹ چھپانے کے باوجود محسوس کی جاسکتی تھی۔ ان کی حالت اس طالب علم کی سی تھی جو امتحان دے کر نتیجہ سننے کا منتظر ہو۔ پاس ہونے کا یقین بھی ہو اور فیل ہونے کی بے یقینی بھی۔

سعدیہ کے اندر عجیب کشمکش برپا تھی۔ جی چاہ رہا تھا اسی وقت لڑکی کو ریجیکٹ کردے' اعلان کردے کہ انہیں یہ رشتہ قبول نہیں۔

لیکن

اس نے اندرونی کشمکش کا عکس بھی چہرے پر لہرانے نہیں دیا۔ بڑے اطمینان اور دلجمعی سے بیٹھی رہی۔ پھر ساس سے اجازت لی اور بولی۔ ''ہمیں یہ رشتہ منظور ہے' ماریا آج سے ہماری ہوئی۔''

مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ماریا کے چہرے پر بہار کے رنگ بکھر گئے۔ اس کی ماں اور بہنیں کھل اٹھیں۔ آج انہوں نے سعدیہ اور اس کی ساس کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔

گھر واپس آکر سعدیہ نے عماد کو بھی مبارکباد دی۔

''بھابی' امی کی پسند پر ہی ہاں کر آئی ہیں یا میری پسند کے معیار کو بھی پیش نظر رکھا؟'' عماد نے ہنس کر اس سے کہا

تو

وہ متانت سے بولی۔ ''بہت کچھ مدنظر رکھا ہے عماد''

رشتہ طے ہوگیا' منگنی کی رسم اسی ہفتے کردی گئی۔ ان لوگوں نے منع کرنے کے باوجود ماریا کے گھر والوں نے خاصے اسراف سے کام لیا۔ سعدیہ اسی ہفتے واپس کراچی چلی گئی۔

شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی اور دونوں طرف سے زوروں سے تیاریاں ہونے لگیں۔

بچوں کو چھٹیاں ہوئیں تو سعدیہ بھی آگئی۔ اب شادی میں چند دن ہی تو باقی رہ گئے تھے۔

''امی!'' اس نے ساس سے کہا۔

''جی بیٹے''

''میں ماریا سے ملنے جاؤں۔''

''ضرور جاؤ۔''

سعدیہ تیار ہو کر ماریا کے ہاں چل دی۔

ماریا کی امی بھابی اور بہنوں نے اس کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ خیر و عافیت دریافت کی' خاطر مدارت کی۔

''اچھا کیا آپ آ گئیں۔'' ماریا کی بھابی نے کہا۔ ''آپ کی ساس اکیلی تھیں۔ شادی کا کام بہت ہوتا ہے۔ آپ کے آنے سے انہیں سہولت ہو جائے گی۔''

''بالکل۔۔۔۔۔۔۔ شادی تو گڈے گڈی کی بھی ہو تو کام ہی کام ہوتا ہے' یہ تو ماشاء اللہ لڑکے اور لڑکی کی شادی ہے اور پھر دونوں طرف اللہ کا فضل ہے۔ آپ بھی تو جہیز کی تیاری میں لگی ہوں گی۔''

''بالکل جی'' وہ بولی۔ ''بڑے کام ہیں۔''

''بڑے جہیز کے لیے بڑے کام ہی ہوں گے۔''

''جی۔۔۔۔۔۔۔!''

بھابی کی جگہ ماریا کی امی نے چونک کر کہا۔ سعدیہ کی بات سے وہ بہت کچھ سمجھنے کے باوجود بھی جیسے کچھ نہیں سمجھی۔

سعدیہ ہنس پڑی۔ ''بڑے گھروں میں لوگ بڑے جہیز ہی کے لیے تو رشتے کرتے ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو بیٹی ۔۔۔۔۔۔۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ جو ہو سکے گا کریں گے۔ کسی بہت بڑے جہیز کی توقع۔۔۔۔۔۔''

''آپ کسر نفسی سے کیوں کام لے رہی ہیں؟'' وہ تمسخر سے بولی۔

ماریا کی امی نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ سعدیہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

کچھ دیر اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں' جس نے ماریا کے گھر والوں کو خاصا پریشان کر دیا۔

پھر

سنعہ نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔۔۔۔۔۔اور واپس آنے سے پہلے بٹوہ کھول کر ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر ماریا کی امی کے ہاتھ میں دے دیا۔

یہ مطالبات کی ایک لمبی فہرست تھی جس میں گھر کے ساز وسامان کے علاوہ لڑکے کے لیے کار کی فرمائش بھی لکھی ہوئی تھی۔

سنعہ کے جانے کے بعد جب یہ فہرست پڑھی گئی تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ماریا کی امی تو صوفے پر گر گئی۔ بھابی بہنیں ہکا بکا رہ گئیں۔ باپ بھائی سب حواس باختہ ہو گئے۔ وہ گھر جس میں دنوں سے شادی کا ہنگامہ تھا ایک دم ہی ماتم کدے کا سا لگنے لگا' خوشیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ دم بخود تھا۔ وہ مطالبات جو فہرست میں درج تھے کسی طور پر پورے کر بھی دیئے جاتے لیکن کار کا مسئلہ حل ہونے کا نہیں تھا اور پھر ماریا اکیلی تو نہ تھی' تین بہنیں اور بھی تھیں۔ وہ لوگ کسی حد تک خوشحال ضرور تھے لیکن یہ مطالبات پورے کرنے کی پوزیشن نہیں تھی ان کی۔

کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ شادی کے کارڈ بھی بانٹے جا چکے تھے۔ تیاریاں بھی تکمیل کے مراحل میں تھیں۔ انکار کی صورت میں رسوائی اور جگ ہنسائی کے علاوہ یہ خوف بھی تھا عین وقت پر یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو اس کا اثر دوسری بچیوں پر بھی پڑے گا۔

قیامت کے لمحے ان لوگوں پر بیت گئے۔ انسان اپنی غرض کا بندہ ہے' جس تلخ تجربے سے وہ خود گزرے اسی کا اسے احساس ہوتا ہے۔ وہ صرف اور صرف اپنے دکھ سے دکھتا ہے' اپنی آنکھ سے انہیں دیکھتا ہے۔ ماریا کی امی جو اس واردات سے بوکھلا گئی تھی' یکسر بھول گئی تھی کہ اپنے بیٹے کے لیے بھی اس نے یہی کیا تھا۔

سنعہ نے گھر آ کر بڑے اطمینان سے ساس اور عماد کو اس فہرست کے متعلق بتایا جو وہ ماریا کے گھر والوں کو دے آئی تھی۔

''کیا۔۔۔۔۔۔؟'' ماں بیٹا ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

سنعہ نے مسکرا کر سر اثباتی انداز میں ہلایا۔ وہ کچھ نہیں سمجھے۔ وہ تو جہیز لینے کے حامی نہ تھے' چہ جائیکہ مطالبات کی لسٹ بھجوانے کے حق میں ہوتے۔ دونوں نے اس فعل کی مذمت کرتے ہوئے سنعہ سے کہا۔ ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟ یہ غلط بات ہے۔ ہم ابھی جا کر معذرت کرتے ہیں۔ ان بیچاروں پر خدا جانے کیا گزر رہی ہوگی۔''

''آپ لوگوں کو جانے کی ضرورت نہیں' وہ خود ہی آئیں گے۔'' سنعہ نے پرسکون انداز میں کہا۔

''بھابی۔۔۔۔۔۔!'' عماد پریشان تھا۔

''بیٹی!'' ساس سنعہ کی بات سمجھ نہ پائی۔

''آپ دونوں مطمئن رہیں۔'' سنعہ نے کہا۔''بس دیکھتے جائیں کہ کیا ہوتا ہے۔''

''تمہاری باتوں کی سمجھ نہیں آتی سنعہ''

''آجائے گی۔''

''لیکن وہ فہرست؟''

''وہ لوگ خود ہی لے کر آجائیں گے۔''

دونوں حیران تھے۔سنعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''میری گزارش ہے کہ آپ لوگ اس معاملہ میں دخل نہ دیں۔وہ لوگ آئیں تو صرف تماشا دیکھیں' دخل نہ دیں۔میں خود ہی ان سے بات کرلوں گی۔''

''یہ وطیرہ کیا اختیار کیا آپ نے' کیوں کیا۔۔۔۔۔۔۔کچھ ہمیں بھی تو بتائیں۔'' عماد نے جھنجھلا کر کہا تو سنعہ نے انہیں سب کچھ بتاتے ہوئے کہا۔''یہ انتقام نہیں' میں صرف انہیں کرب کے ان لمحوں سے روشناس کرانا چاہتی ہوں جو ان کے فعل سے ہم پر گزرے تھے۔انہیں احساس دلانا چاہتی ہوں کہ بیٹیوں کے والدین کی پوزیشن کتنی نازک ہوتی ہے اور شادی سے چند دن پہلے رشتہ ٹوٹ جائے تو لڑکی اور اس کے لواحقین کے دل پر کیسی قیامتیں ٹوٹتی ہیں۔عماد ابھی ماریا کے دو بھائی اور بھی ہیں۔یہ سبق انہیں سکھانا ہی پڑے گا۔ورنہ وہ دو اور خاندانوں پر بھی برق بن کر گر سکتے ہیں۔''

''لیکن بھابی۔۔۔۔۔۔ماریا۔۔۔۔۔۔آپ تو بے قصور لڑکیوں کو سزا نہیں دینا چاہتیں۔ماریا کا کیا قصور ہے؟'' عماد بولا۔

''جو غلطی ان لوگوں نے کی ہمیں وہ نہیں کرنی چاہیے بیٹی'' ساس نے کہا۔

''نہیں ہوگی امی۔۔۔۔۔۔لیکن کرب واذیت کے لمحوں سے گزار کر انہیں سبق ضرور سکھانا ہے۔'' سنعہ نے کہا۔

حسب توقع ماریا کی امی' بھابی اور خاندان کے چند معزز اور معتبر لوگ آگئے۔وہ جس قدر پریشان تھے' خاص کر ماریا کی امی ابا ۔۔۔۔۔۔وہ بیان سے باہر تھا۔ان کے منہ سے تو بات نہ نکل رہی تھی۔سراپا عجز بنے تھے اور ہاتھ باندھ باندھ کر کہہ رہے تھے۔

''یہ ہماری عزت کا مسئلہ ہے' شادی کارڈ بانٹے جاچکے ہیں۔۔۔۔۔۔''

دوسرے معتبر اور معزز لوگ سنعہ اور اس کی ساس کو اس نازیبا مطالبے پر براہ راست تو سرزنش نہیں کر سکتے تھے کہ لڑکے والے تھے نازک پوزیشن تھی' پھر بھی ایسے لوگوں کی مذمت کر رہے تھے جو ایسے مطالبات پیش کرتے ہیں اور شادی جیسے مقدس فریضے کو

کاروبار بناتے ہیں۔

سنعہ نے عماد اور ساس کو خاموش رہنے کی تاکید کر رکھی تھی۔ اس لیے وہ دونوں خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ معاملہ طے سنعہ نے کرنا تھا اس لیے صرف وہی بول رہی تھی۔

اور

سب اسی کی منت سماجت کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی بات پر اڑی تھی اور کار نہ ملنے کی صورت میں رشتہ توڑنے کی بات کر رہی تھی۔ عماد اور اس کی ساس سے لڑکی والوں کی بے بسی دیکھی نہ جا رہی تھی۔ ماریا کی ماں رو رو کر جھولی پھیلا کر رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ باپ سر جھوڑائے مجسم بیکسی بنا بیٹھا تھا۔

سنعہ کو امی یاد آ رہی تھی۔ کچھ ایسے ہی اس کی امی نے بھی ان لوگوں سے رحم کی بھیک مانگی ہوگی۔

''ہمارے عزت آپ کے ہاتھ میں ہے' کار ہمارے بس میں نہیں۔'' ماریا کی امی گھگیائی۔۔۔۔۔۔۔تو سنعہ نے تیکھے لہجے میں طنز کیا۔ ''ایک بیوہ عورت سے اگر لڑکے لیے سکوٹر کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے تو پھر آپ جیسے صاحب حیثیت لوگوں سے کار کا مطالبہ کیوں نہیں جا سکتا۔''

ماریا کی ماں اور باپ نے چونک کر سنعہ کی طرف دیکھا۔

''دیکھئے' غور سے دیکھئے مجھے اور پہچانئے' میں وہی ہوں جس کا رشتہ شادی سے چار دن پہلے آپ نے محض اس لیے توڑ دیا تھا کہ میری غریب ماں آپ کی بھیجی ہوئی مطالبات کی فہرست پوری نہ کر سکتی تھی۔''

''تم۔۔۔۔۔۔۔تم۔۔۔۔۔۔۔'' ماریا کی ماں ششدر رہ گئی۔

''ہاں' میں وہی ہوں جسے آپ نے دھتکار دیا تھا۔ اب۔۔۔۔۔۔۔اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ۔۔۔۔۔۔۔''

ماریا کی ماں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا' اس کا باپ گھبرا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں معاف کر دو بیٹی''

وہ انتہائی درشت لہجے میں بولی۔ ''آپ جا سکتے ہیں' کار دے سکتے ہیں تو شادی ہو جائے گی بصورت دیگر ہماری طرف سے رشتہ ختم۔ معافی کی گنجائش ہے نہ ضرورت۔۔۔۔۔۔۔تشریف لے جائیے۔''

ماریا کی امی اور ابا تو مٹی کے بے جان تودوں کی طرح صوفے پر ڈھیر تھے۔ ساتھ آئے لوگ سنعہ کی منت و سماجت کر رہے تھے۔ ان کی طرف سے معافیاں مانگ رہے تھے۔ انہیں برا بھلا کہتے ہوئے ماریا کے لیے بھیک مانگ رہے تھے۔

لیکن

لگتا تھا سعدیہ پر کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ عماد اور امی بے چین ہو رہے تھے' لیکن خاموش تھے۔

معاملہ طے نہ ہو سکا۔

وہ سب واپس جانے کے لیے اٹھے' ٹوٹے پھوٹے بکھرے بکھرے منتشر منتشر۔۔۔۔۔۔۔ ماریا کی امی اور ابا کو تو سہارا دے کر ساتھ آنے والوں نے اٹھایا۔ ان کے ذہن ماؤف سے ہو رہے تھے۔ کار دینے کی حیثیت نہ تھی' رشتہ ٹوٹ ہی گیا تھا۔۔۔۔۔۔ ان کے دلوں پر جو بیت رہی تھی جانتی تھی۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے کہ سعدیہ نے پکارا۔ ''رکیے ذرا''

''فرمایئے'' کس صاحب نے بے دلی سے کہا۔

''شادی مقررہ تاریخ پر ہی ہوگی۔'' سعدیہ نے کہا۔

''لیکن ۔۔۔۔۔۔ کار۔۔۔۔۔۔'' ماریا کی ماں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ باپ بھی گھگیایا۔ ''کار۔۔۔۔۔۔''

''کار کی ضرورت ہے نہ جہیز کی۔'' سعدیہ نے پروقار انداز میں کہا۔

سب نے حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ماریا کی ماں کو تو جیسے اس کی بات ہی سمجھ نہ آئی' جلدی سے پوچھا۔ ''کیا کہا؟''

''یہی کہ ہمیں صرف ماریا کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔۔ جہیز چاہیے نہ کار۔''

''بیٹی۔۔۔۔۔۔!'' ماریا کی ماں سعدیہ سے لپٹ گئی۔ ''سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں'' سعدیہ نے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔ ''ہمیں ماریا کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ ماریا جیسی انمول چیز پا کر اور کسی چیز کی ضرورت باقی رہتی ہے کیا؟''

''لیکن وہ مطالبات۔۔۔۔۔۔؟'' اس کا باپ روہانسی آواز میں بولا۔

''وہ تو آپ جیسے لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے تھا۔ واردات جب تک انسان پر خود نہ گزرے اسے اس کی خوفناکی کا احساس نہیں ہوتا۔''

''بالکل' بالکل'' سب سر جھکاتے ہوئے بولے۔

''آپ کے اور بھی بیٹے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کے لیے یہ سبق کافی ہوگا۔'' سعدہ نے کہا تو ماریا کی ماں اس سے لپٹ کر بے اختیار ہو کر رو دی۔ ''تم نے ہماری آنکھیں کھول دیں بیٹی''

''ہم تمہارے احسان مند ہیں۔'' باپ نے کہا۔

ساس اور عماد نے سعدہ کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔

سعدہ نے سب سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ خوش تھی۔ اس نے خود غرض لوگوں کو ایسا سبق سکھایا جو وہ زندگی بھر بھول نہیں سکتے تھے۔

سب گپ شپ لگانے لگے۔ چائے بھی بن کر آ گئی۔ سب خوش تھے۔

لیکن

ماریا کی امی اور ابا کے سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ سعدہ سے نگاہیں ملانے کی اپنے میں ہمت نہیں پا رہے تھے۔ اس نے ان پر اتنا بڑا احسان کیا تھا وہ اس کے بارے عمر بھر چھٹکارا نہیں پا سکتے تھے۔

اور

نہ ہی وہ سبق بھول سکتے تھے

جو اس نے انہیں سکھایا تھا۔

◆◆◆

ذرا سی کوتاہی

آسمان کی رنگت پرانے تانبے کی سی ہو رہی تھی۔ چلچلاتی دھوپ زمین کا سینہ جلا رہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ تپتی جلتی سڑک کے کنارے درختوں جھاڑیوں اور خودرو سبزے کی خشکی اور پیلاہٹیں گرمی کی شدت کا اظہار تھیں۔ پانی کئی دنوں سے نہیں برسا تھا۔ خاک و دھول ہر ڈالی پتے کا چہرہ ڈھانپ چکی تھی۔

سڑک اس وقت تقریباً سنسان تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی ادھر سے گزرتی تو دھول کا ریلا سا دور تک اس کا تعاقب کرتا چلا جاتا۔ یہ سڑک اس آبادی کی طرف جاتی تھی' جو شہر سے خاصی دور تھی۔ شہر کی گھٹن اور تعفن سے جو صاحب حیثیت لوگ بیزار ہو چکے تھے' اب اپنے ٹھکانے یہاں بنا رہے تھے۔ کئی کوٹھیاں بن چکی تھیں' کئی زیر تعمیر تھیں۔ بیشمار پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے اور خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ اس لیے زمین کی قیمتیں دیکھتے دیکھتے ہی اتنی چڑھ گئی تھیں کہ عام آدمی کی قوت خرید سے باہر ہوتی جا رہی تھیں۔

اکا دکا ہی کوٹھیوں میں لوگ آن بسے تھے۔ کئی ادھورے گھروں میں بھی چراغ جلنے لگے تھے۔ سروں پر اپنی چھت ہی غنیمت اور نعمت تھی۔ گھر ان چھتوں تلے رہ کر بھی مکمل کروائے جا سکتے تھے۔

یہاں پر آ بسنے والوں کو ابھی خاصے مسائل کا سامنا تھا۔ چھوٹی موٹی دکانیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن اکثر خریداری کے لیے شہر جانا پڑتا تھا۔ درمیان کی لمبی سڑک کم از کم دو میلوں پر محیط تھی۔ گاڑیوں سکوٹروں والوں کے لیے تو بڑا مسئلہ نہیں تھا' ہاں جن کے پاس اپنی سواری نہیں تھی' وہ لوگ کوششوں میں لگے تھے کہ کوئی سرکاری بس یا پرائیویٹ وین ہی اس روٹ پر چلنے لگے تو مشکل آسان ہو۔

یہ مشکل شہر سے وہاں جانے والوں کو بھی تھی۔ سائیکل پر جاتے بھی خاصا وقت لگتا۔ رکشا دگنے دام لیتا تانگے ادھر آتے ہی نہ تھے۔ اور وین یا سرکاری بس کا روٹ ہی نہیں تھا۔ سب سے زیادہ ڈاکیے کو تکلیف و تردد کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھی تو صرف ایک خط پہنچانے کے لیے اسے اتنی دور جانا پڑتا تھا۔

ان دنوں اس حلقے میں نصیر کی ڈیوٹی لگی تھی۔ بڑا وسیع حلقہ تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے پاس اپنی سائیکل تھی۔ وہ دور دور کے گھروں تک بڑی مستعدی سے ڈاک پہنچا دیا کرتا تھا۔ اس سے کبھی کسی کو شکایت نہ ہوتی تھی۔ اور نہ ہی خود اس نے کبھی خط پہنچانے میں کوتاہی کی تھی۔

لیکن

اس دن

آسمان سے جیسے آگ برس رہی تھی' زمین آگ اگل رہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی اور سڑک کنارے کی ہریالی خشک ہو کر دھول مٹی سے اٹی تھی۔

اس دن نصیر کی سائیکل خراب ہو گئی تھی۔ مرمت کروانے کے لیے دی تھی جو اسے تقسیم ڈاک کے وقت نہ مل سکی۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔ قریب قریب کے علاقوں میں خط تقسیم کرنے کے بعد اس کے تھیلے میں وہ نیلا لفافہ رہ گیا جو اس بستی کے نئے مکان میں دینا تھا' جس میں کوئی دو ماہ پہلے ہی ارشد صاحب آباد ہوئے تھے۔

نصیر سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی۔ گرمی جھلسا دینے والی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ایک سوکھے درخت تلے ستانے کے لیے رک گیا۔ پسینہ سر سے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔

اس نے بستی کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ ابھی کم از کم ڈیڑھ میل دور تھی۔ اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اتنی دور پیدل جانا وہ بھی صرف ایک خط پہنچانے کے لیے۔۔۔۔۔۔۔

وہ اپنے اندر انکاری سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ درخت کے تنے سے لگے لگے اس نے اپنے خاکی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر لفافہ نکالا۔ نیلے رنگ کے لفافے پر بیرون ملک کی ٹکٹ لگی تھی۔ اس نے پتہ پڑھا اور پھر بھیجنے والے کا نام و پتہ دیکھا۔ یہ خط لندن سے آیا کسی نوید نامی آدمی کی طرف سے ارشد حسین صاحب کے نام لکھا گیا تھا۔

اس نے خط کئی بار الٹا پلٹا۔

کچھ دیر کے لیے وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ ہو سکتا ہے' خط معمولی خیر خیریت کا حامل ہو اور ہو سکتا ہے کسی اہم بات کے لیے لکھا گیا ہو۔

اسے کیا کرنا چاہیے؟

نصیر نے خط تھیلے میں واپس رکھتے ہوئے سوچا۔ احساس فرض مجبور کر رہا تھا کہ یہ خط وہ جا کر ارشد صاحب کے ہاں دے آئے۔

لیکن

شدت کی تپش اور برستی آگ دل و دماغ کو جھلسا رہی تھی۔ اتنی دور پیدل جانا عذاب لگ رہا تھا۔

وہ کئی منٹ سوچتا رہا۔ ہاں اور نہ کے بین بین کی کیفیت اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔

پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ خط منزل مقصود تک پہنچا دینا چاہیے لیکن قدم قدم چل کر نہیں۔ اس نے سوچا اس طرف جانے والی کسی بھی سواری سے لفٹ لے کر بستی تک چلا جائے گا اور خط پہنچا آئے گا۔

وہ سڑک کے قریب آ کر ننگے آسمان تلے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اتفاق ہی تھا کہ سوائے دو ایک تیز رفتار گاڑیوں کے کوئی اور سواری ادھر سے ادھر نہ گئی۔ اس نے بڑے صبر سے انتظار کیا کہ کوئی تانگہ ریہڑہ یا سائیکل سوار ادھر سے گزرے تو وہ انہیں روک کر استدعا کرے۔ لیکن

تقریباً آدھ گھنٹہ چلچلاتی دھوپ میں کھڑے رہنے کے بعد بھی ان کی مشکل حل نہ ہوئی۔ گرمی کے مارے اس کا برا حال تھا۔ پسینہ بہہ رہا تھا۔ زبان خشک ہو رہی تھی اور دماغ کھوپڑی کے اندر پگھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ تھک کر پھر سوکھے خشک پتوں والے درخت تلے آن کھڑا ہوا۔ اس نے سر پر رکھے ململ کے رومال سے اپنا چہرہ پونچھا۔ گردن کے گرد رومال پھیرا' بازو خشک کیے۔

''توبہ توبہ'' اس کے لبوں سے نکلا۔ ''کیا مصیبت ہے۔ اس کم بخت سائیکل نے آج ہی خراب ہونا تھا۔ اتنی دور تو پیدل جانے سے میں رہا۔''

اس نے پھر تھیلے میں سے لفافہ نکالا۔ اسے دیکھا اور پھر لاپرواہی سے اسے اپنی خاکی وردی کی جیب میں رکھ کر بولا۔ ''آج نہیں جایا جا سکتا' کل پہنچا دوں گا خط۔۔۔۔۔۔۔ کل تو سائیکل مل ہی جائے گی۔ ایک دن سے کیا فرق پڑے گا؟ کل پہلے یہ خط پہنچاؤں گا پھر دوسری ڈاک تقسیم کروں گا۔''

اس نے جیب میں ڈالے خط کو ہاتھ سے تھپکا۔ پھر مطمئن ہو کر خاکی تھیلا کندھے پر ڈالا۔ ململ کا ملگجا سا کپڑا دوہرا تہرا کر کے سر پر رکھا اور واپس جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

وہ بڑا فرش شناس تھا اسی لیے پلٹتے وقت اس کے ضمیر نے ملامت بھی کی۔

لیکن

وہ کالونی کی طرف جا بھی نہیں تو سکتا تھا۔ اتنی گرمی' چلچلاتی دھوپ' برستی آگ۔۔۔۔۔۔۔ اس سے نہیں جایا جا سکتا تھا۔

وہ واپس مڑ گیا۔ لفافہ اس کی جیب میں تھا اور ڈاک تقسیم کرنے کے بعد خالی تھیلا کندھے پر۔ وہ بار بار اپنے آپ کو مطمئن کرنے

کے لیے کہہ رہا تھا۔ ''کوئی بات نہیں' ایک دن سے کیا فرق پڑے گا۔ کل صبح صبح یہی کام کروں گا' کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اتنا اہم اور ضروری بھی نہیں ہوگا خط۔۔۔۔۔۔۔ اہم اور ضروری بات ہوتی تو خط کی بجائے ٹیلیگرام دیا ہوتا خط لکھنے والے نے۔''

وہ اپنے آپ کو تسلی دیئے گیا۔

واپسی کا راستہ وہ اسی خط کے متعلق سوچے گیا۔ دو ایک بار تو جی چاہا کہ خط کھول کر پڑھ ہی لے۔ اگر بہت ہی ضروری ہوا تو پھر کسی نہ کسی طرح یہ پہنچا ہی دے۔ لیکن دل نے یہ بات نہ مانی۔

خط کل پہنچانے کا سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

چھٹی کے بعد وہ جب گھر پہنچا تو نیلا لفافہ اس کی جیب میں تھا۔ اس کی وردی پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ گھر آتے ہی وہ کھری چارپائی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

''بہت تھک گئے ہو آج'' اس کی بیوی چھوٹے سے صحن میں نل تلے کپڑے دھو رہی تھی۔ میلے کپڑوں سے جھاگ والے ہاتھ پونچھتے ہوئے اٹھ کر اس طرف آ گئی۔

''ٹھنڈا پانی ہوگا۔'' اس نے سر پر رکھے رومال کو ہاتھ میں لے کر چہرہ اور گردن پونچھتے ہوئے کہا۔

اس کی بیوی نے بیٹی کو آواز دی۔ ''نی جیراں۔۔۔۔۔۔۔ ابے کے لیے ٹھنڈا پانی بنا لا۔ برف میں نے تولیے میں لپیٹ کر رکھی ہوئی ہے۔''

''اچھا اماں'' بیٹی نے برابر کی کوٹھڑی میں سے نکلتے ہوئے کہا۔

اس کی بیوی جھالر لگی پنکھیا لے کر اسے جھلنے لگی۔ پھر اپنے آپ سے جیسے شاکی انداز میں بڑبڑائی۔ ''ایک بجلی کا پنکھا ہی لے لیں کسی طرح' اتنی جھلسا دینے والی گرمی میں آتے ہو' گھر آ کر دو لمحے سکون نہیں ملتا۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ پنکھے کی فرمائش بیوی کئی دفعہ کر چکی تھی۔ پیار محبت سے بھی اور لڑ جھگڑ کر بھی لیکن اس کی تنخواہ اس بات کی متحمل کہاں ہو سکتی تھی۔ مشکل سے دو وقت کی روٹی دے پاتا تھا بیوی بچوں کو۔۔۔۔۔۔۔ سال میں ایک جوڑا بھی سب کے لیے بن جاتا تو غنیمت تھا۔ وہ کئی دنوں سے اپنی بڑی بیٹی کی پھٹی اوڑھنی دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ وہ برف والا پانی لے کر سامنے آئی تو بیوی کے پنکھے کے ذکر پر وہ جز بز ہو گیا۔ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تین چار بچے بھی اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ دونوں لڑکوں کو اس نے جانے کس مشکل سے سکول میں داخل کروایا تھا۔

ان کے یونیفارم خریدنے کی فکر رہتی تھی۔

پانی پی کر وہ بچوں سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی تھکان کچھ اترنے لگی۔

''وردی میلی اور پسینے میں بھیگی ہوئی ہے اتار دو' دھو ڈالوں۔ ویسے بھی کپڑے ہی دھو رہی تھی میں۔ دوسری وردی تو اب پہننے کی نہیں رہی۔''

اس نے بیٹھے بیٹھے خاکی شرٹ اتار دی۔

''بنیان بھی اتار ڈالو۔'' بیوی نے شرٹ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کپڑے اندر پڑے ہیں' بدل لو' میں انہیں دھو ڈالوں۔''

وہ اٹھ کر اندر گیا۔ سلیٹی رنگ کے کاٹن کا جوڑا پہنا۔ میلے کپڑے بیوی کی طرف اچھالے۔ پھر واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''کیوں جیراں!'' اس نے بڑی بیٹی سے کہا۔ ''کھانا نہیں ملے گا' کچھ پکایا ہے؟''

''ہاں ابا' کریلے بھونے ہیں آج' روٹی بھی تنور کی لگوا رکھی ہے۔''

''واہ وا۔۔۔۔۔۔ کریلے۔۔۔۔۔۔ لاؤ بھئی آج تو سیر ہو کر کھائیں گے۔ تیری ماں نے دہی تو نہیں منگوائی ہوگی۔ لسی ساتھ ہوتی تو۔۔۔۔۔۔''

''ابا میں لسی کا ڈول لایا تھا سامنے والے گھر سے' انہوں نے بھینس لی ہے نا۔ کہتے ہیں روز لسی لے جایا کرو۔'' اس کا گیارہ سالہ بیٹا بولا۔

''واہ بھئی' واہ مزہ آ گیا۔'' وہ چارپائی کے اوپر پاؤں کھینچ کر بیٹھ گیا۔ جیراں کچھ ہی دیر میں رکابی میں کریلے اور چنگیر میں روٹیاں رکھ کر لے آئی۔

''تم سب کھا چکے؟'' اس نے بچوں سے پوچھا۔

''سب کھا چکے ہیں' اب ان کے منہ میں لقمے نہ ڈالنے لگنا' آپ ہی کھانا آرام سے۔'' بیوی نل کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

''اور جیراں پنکھا جھل ابے کو' اس تپتی دوپہر میں آیا ہے۔ بہت گرمی بھا کے آتا ہے۔''

وہ کپڑے دھونے کے لیے پیڑھی پر جا بیٹھی۔ سامنے بڑا سا لوہے کا لگن تھا۔ ایک پرانی بالٹی میں دھلے ہوئے کپڑے تھے' دوسری طرف بچوں کے بے حد میلے کپڑوں کی ڈھیری سی لگی تھی۔

نصیر بچوں سے باتیں کرتے کرتے چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھکان اور گرمی کے باوجود اس کو نیند آ گئی۔ جیراں اسے پنکھا جھلنے لگی۔

باقی بچوں کو اس نے باہر بھگا دیا۔ ''ابے کو سونے دو شور نہ کرو جاؤ گلی میں کھیلو جا کر۔''

بچے بھاگ گئے۔

''اے جیراں!'' ماں کی آواز پر جیراں باہر لپک کر آئی۔

''کیا ہے اماں؟''

''یہ تیرے ابے کی جیب میں لفافہ ہے کوئی۔۔۔۔۔۔۔ میرے ہاتھ گیلے ہیں تو نکال لے۔ جا کر چھتی پر رکھ دے۔''

''اچھا اماں''

جیراں نے لفافہ نکالا' شرٹ ماں کو واپس کی اور لفافہ لے کر اندر آ گئی۔ دیوار پر برتن رکھنے کے لیے لکڑی کی چھتی بنی تھی۔ اماں نے شیشے کے پیالے اور گلاس اس پر سجا رکھے تھے۔ پلیٹیں بھی دھری تھیں۔ جیراں نے احتیاط سے لفافہ ایک پلیٹ میں ڈال دیا۔ پھر باپ کے سرہانے کھڑی ہو کر اسے پنکھا جھلنے لگی۔

نصیر زیادہ دیر سو نہیں پایا۔ جیراں کے پنکھا جھلنے کے باوجود بدن پسینے میں شرابور تھا۔ صحن میں اتنی تیز زرد دھوپ اب دالان کی طرف رخ موڑ رہی تھی۔ وہ گرمی سے بلبلا اٹھا۔ جیراں برابر پنکھ جھل رہی تھی۔ اسے اپنی بیٹی پر ترس آیا۔

''بس کر بیٹی' پنکھے سے کام نہیں بن رہا' میں نہاتا ہوں۔ پانی ہے کہ تیری ماں نے کپڑے دھو دھو کر ختم کر ڈالا۔۔۔۔۔۔۔؟'' وہ پسینہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابھی پانی آ رہا ہے ابا۔۔۔۔۔۔۔ جا کر نہا لو۔'' جیراں بولی۔

وہ نہانے کے لیے صحن میں نکل آیا۔ اس کی بیوی اب دھلے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر رسی پر ڈال رہی تھی۔

''نہا لو جلدی جلدی۔۔۔۔۔۔۔ نل بند ہونے والا ہے۔ ویسے بالٹی بھی بھری ہوئی ہے۔'' وہ کپڑے پھیلاتے ہوئے بولی۔

نصیر کچی پکی منڈیر والے غسل خانے میں گھس گیا۔ جتنی دیر پانی آتا رہا وہ نہاتا رہا۔ تازہ دم ہو کر باہر نکلا۔ بالوں میں کنگھا کیا اور گلی میں نکل گیا۔ پان والے کی دکان پر اکثر شامیں دو تین دوست اکٹھے ہو کر بیٹھتے تھے۔ موسم مہنگائی سیاست ہر چیز زیر بحث آتی۔ اپنی اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق سب ہی بولتے رائے دیتے سکیمیں بناتے اور کچھ وقت مالی پریشانیوں اور سماجی ناہمواریوں کی کوفتوں سے ہٹ کر گزارتے۔ ہنسی مذاق بھی ہوتا' لطیفے بازی بھی۔ طنز و تمسخر سے بھی دل بہلتا اور چٹکلے بھی ایک دوسرے کو سنائے جاتے۔ یوں جب وہ لوگ گھروں کو لوٹتے تو ذہن ہلکے پھلکے ہوتے۔ بیوی بچوں کے ساتھ بھی گپ شپ لگانے اور ان کی سننے کو جی اور

ذہن آمادہ ہوتا۔

نصیر رات اترے واپس آیا۔ بیوی نے دال روٹی آگے رکھ دی۔ دوپہر کے بھنے کریلے بھی ایک چپاتی پر رکھے تھے۔

وہ ابھی کھانا کھا بھی نہ پایا تھا کہ اس کی بہن جو دوسرے محلے میں رہتی تھی' حواس باختہ سی آ کھڑی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ چھوٹے بھائی بشیرے کی بیٹی جل گئی ہے۔ پانی کی ابلتی دیگچی اس پر آن گری ہے۔

کھانا وہیں چھوڑ نصیر اور اس کی بیوی اس کے ساتھ بشیرے کے گھر دوڑے۔ جلنے والی بچی کو سول ہسپتال پہنچایا۔ پیسوں کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ دوائیوں کے لیے دوڑے لپکے' لیکن بچی بچ نہ سکی۔

نصیر اس حادثے کی وجہ سے دو تین دن ڈیوٹی پر نہ جا سکا۔

اور

جب ڈیوٹی پر گیا تو اس کی تبدیلی دوسرے حلقے میں ہو چکی تھی۔ نیا آنے والا ڈاکیہ تین دن سے اس کے حلقے میں ڈاک بانٹ رہا تھا۔

نصیر کو اس تبدیلی سے کوئی ملال نہ ہوا۔ ڈیوٹی جب دینا ہی تھی تو حلقہ کوئی بھی ہو فرق کیا پڑتا تھا۔ یوں نصیر نئے حلقے میں ڈاک بانٹنے لگا۔ اور اس کے ذہن سے وہ خط بالکل ہی نکل گیا جو لندن سے آیا تھا اور جسے اس نے کسی ارشد صاحب کے ہاں اس نئی کالونی کی نئی کوٹھی میں پہنچانا تھا۔

وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ نوید اتنے اہم اور ضروری معاملے میں بھی اتنی بے حسی کا ثبوت دے گا۔ اس کی امی نے ساری صورت حال سے اسے آگاہ کر دیا تھا اور بہ منت لکھا تھا کہ خط کا جواب اس خط کے ملتے ہی دے دے ورنہ دیر اندھیر ہو جائے گی۔ ماں باپ کو بھی اس نے رو رو کر انتظار کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ورنہ اس کے ابو تو نوید کے جواب کا انتظار کرنے کے حق میں بھی نہ تھے۔ جانتے تھے کہ نوید اور ارسہ صرف خالہ زاد ہی نہیں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ پسند اب جن انتہاؤں کو چھو رہی تھی شاید وہ اس بات سے لاعلم تھے' اسی لیے تو اب جو ارسہ کے لیے رشتہ آیا تھا وہ فوری طور پر کر دینا چاہتے تھے۔ رشتہ صرف موزوں ہی نہیں انتہائی اچھا لگا تھا۔ برسر روزگار' صاحب جائیداد' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت شریف گھرانے کا لڑکا اسد شیخ۔ ارسہ کے لیے وہ لوگ خواہشمند بھی تھے۔ جہیز کا بھی کوئی مسئلہ نہیں اٹھایا تھا۔ بس ارسہ انہیں پسند آ گئی تھی اور وہ رشتہ لینے کی زبردست خواہش لے کر ان کے ہاں آن پہنچے تھے۔ ارسہ

نے بی اے کرلیا تھا۔ رشتے کی تلاش تھی۔ گو خالہ نے دبی زبانی میں اپنی اور نوید کی خواہش کا کئی بار اظہار کیا تھا۔ لیکن نوید اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔ نوکری نہیں ملی تھی۔ دو تین پرائیویٹ فرموں میں کام کر چکا تھا۔ لیکن یہ کام اس کی تعلیمی قابلیت سے لگا نہیں کھاتے تھے' اس لیے چھوڑ دیئے تھے۔ اب بہتر مستقبل کی تلاش میں دیار غیر پہنچا تھا۔ کام کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا بھی پروگرام تھا۔ اس لیے بے حد مصروف ہو گیا تھا۔ اپنی زندگی کی نئی اور روشن جہتیں تلاش کرنے کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ وہ اپنے کام اور ذریعہ آمدنی سے مطمئن ہو کر ارسہ کے لیے خواستگاری اور حصول کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ارسہ کو خط بھی لکھا کرتا تھا۔ ارسہ بھی جواب دے دیا کرتی تھی۔ لیکن وہ مصروف اتنا تھا کہ خط لکھنے کی فرصت بھی کبھی کبھار ہی نکال پاتا۔ نہ تو وہ کہیں بھاگا جا رہا تھا نہ ہی ارسہ۔۔۔۔۔۔۔ یہ خیال اس کے ذہن میں جاگزیں تھا۔ اسی لیے اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی دیر اندھیر بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن ارسہ کے لیے یہ رشتہ اچانک ہی آ گیا تھا۔ ماں باپ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لڑکے والوں کا کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ وہ ایک ماہ کے اندر اندر شادی کر کے ارسہ کو اپنے گھر لے جانا چاہتے تھے۔ اس عجلت کی وجہ لڑکے کی ماں کی بیماری تھی۔ وہ یوری کینسر کی مریضہ تھی۔ زندگی کا چراغ آخری لو دے رہا تھا۔ اس لو میں وہ اپنے پیارے بیٹے کی دلہن کا روپ نکھرا چہرہ دیکھ لینے کی متمنی تھی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات تھی۔ یہ رشتہ رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی' سوائے اس کے کہ نوید اپنوں میں سے تھا اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

لیکن

مستقبل کیا تھا؟

یہ پوری طرح ارشد صاحب اور زرینہ تو کیا نوید کے والدین بھی نہ جان پائے تھے۔ وہ خط اتنی تاخیر سے لکھا کرتا تھا' بعض اوقات تو تین تین چار چار خطوں کا جواب اس کا مختصر سا خط ہوا کرتا تھا۔ ذہن میں وہم بھی اٹھنے لگتے تھے۔ یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ اپنا مستقبل سنوارنے میں سنجیدگی سے منہمک ہے یا اس معاشرے کی رنگ رلیوں میں کھو کر اس کے پاس جو کچھ تھا وہ بھی گنوا چکا ہے۔ دھڑکا اپنی جگہ' لیکن آس نہیں ٹوٹی تھی۔

اسی لیے جب ارسہ کے رشتے آنے کی خبر نوید کی امی تک پہنچی تو وہ بھاگم بھاگ بہن اور بہنوئی کے پاس آئی۔

''ارسہ کو بیٹی بنانے کے خواب میں اس کے بچپن ہی سے دیکھ رہی ہوں۔ بخدا میرے خواب نہ توڑیئے۔ نوید اسی کی خاطر کالے

کوسوں دور گیا ہے۔ یہاں اسے اپنی پسند کا کام نہیں ملا تھا۔ وہ اپنا آپ بنانا چاہتا ہے۔ اک خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے' وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے موقع ملا ہے۔ آپ کچھ انتظار تو کریں۔''

کچھ ایسے ہی تاثرات کو ارسہ نے بھی راہ دی۔ منہ پھٹ نہیں تھی لیکن آنسو بہا کر اس نے اپنا عندیہ ماں باپ پر ظاہر کیا۔ وہ نوید کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں اس کا ایمان تھا کہ صادق جذبے کسی ماحول میں رنگ جائیں مٹتے نہیں۔

اپنی بیٹی اور بہن کی خاطر زرینہ نے بھی ارشد سے کہا تھا۔ ''ٹھیک ہے کہ یہ رشتہ بہت اچھا ہے لیکن اپنوں کو یوں ٹھکرانا بھی نہیں چاہیے۔ پھر ارسہ کو بھی آپ دیکھ رہے ہیں' کتنی بجھ گئی ہے۔''

''سب ٹھیک ہے لیکن ایک بات بتاؤ۔'' ارشد صاحب بھی فیصلہ کن انداز میں بولے تھے۔

''کیا؟''

''تم نوید کا انتظار کرنا چاہتی ہو؟''

''ارسہ کے لیے۔۔۔۔۔۔''

''تمہیں کیا یقین ہے کہ نوید لندن جا کر اپنی زندگی سنوار رہا ہے۔''

''خط میں تو یہی لکھتا ہے۔''

''خط سال میں کتنے لکھے ہیں اس نے۔۔۔۔۔۔؟''

''مصروف جو ہے۔''

''مصروفیت رنگ رلیوں اور اس معاشرے میں کھو جانے کی بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''ایسا نہیں ہے نوید۔۔۔۔۔۔ ایسا تو نہیں ہے۔''

''بھانجا ہے اس لیے کہہ رہی ہو۔''

''نہیں' میں اسے جانتی ہوں۔''

''وہاں جا کر اچھے اچھوں کے پرت کھل جاتے ہیں' نوید تو نوجوان۔۔۔۔۔۔''

''وہ ایک خاص مقصد لے کر یہاں سے گیا ہے۔ اسے اپنی زندگی بنانا ہے۔ وہ کام کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کر رہا ہے۔''

''دیکھو زرینہ''

''جی''

''بات یہ ہے کہ ایک تو نوید کے متعلق صحیح پتہ نہیں کہ وہ کچھ کر بھی رہا ہے یا نہیں' دوسرے کر بھی رہا ہے تو کچھ بننے کے لیے اسے ایک مدت درکار ہوگی۔ انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس کی آس پر اتنا بے مثال رشتہ چھوڑ دیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ عقلمندی ہے کیا؟''

عقلمندی تو نہیں تھی لیکن کچھ خون کے رشتے تھے جو متقاضی تھے کہ نوید کا انتظار کر ہی لیا جائے۔ پھر بچوں کی پسند کا بھی کچھ کچھ علم تھا۔

زرینہ سوچوں میں پڑ گئی۔ بہن اور بیٹی کا سوچتی تو انتظار کر لینے میں ہی مصلحت تھی لیکن ارشد کے دلائل پر غور کرتی تو یہ رشتہ کھو دینا بھی بیوقوفی تھی۔ قسمت سنہری موقعے روز روز تو نہیں دیتی۔

بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا کہ نوید کو خود خط لکھے۔ اور اس کی مرضی دریافت کرے۔ تب تک اس رشتے کو بھی ہاتھ میں رکھا جا سکتا تھا۔

اس نے نوید کی امی سے بھی صلاح مشورہ کیا' وہ رضامند ہو گئی۔

''میں خود وضاحت سے اسے خط لکھتی ہوں۔'' زرینہ نے کہا۔ ''مجھے امید ہے وہ جواب دے گا۔ پھر اسی کے جواب کی روشنی میں کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے زرینہ۔۔۔۔۔۔۔ جو میں تم لوگوں سے بار بار کہہ چکی ہوں' نوید کی میں ماں ہوں' اس کی پسند کا مجھے علم ہے۔ ہر خط میں وہ یہی لکھتا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو آپ لوگوں کے سامنے مجھے دامن پھیلانے کے لیے کہے گا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو' لیکن ارشد بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی سوچتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات ابھی مفروضہ ہی ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ خود نوید کو خط لکھوں۔ اس کا جواب آنے پر بات طے ہو جائے گی۔ ارشد کو قائل اسی طور کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی کوئی نوید کے دشمن تو نہیں۔ اور پھر ارسہ کی مرضی کا بھی انہیں کچھ کچھ علم ہے۔''

''بس تم آج ہی خط لکھو۔''

''ٹھیک ہے۔''

''لکھنا کہ خط ملتے ہی جواب دے دے کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ آئندہ کا پروگرام ہے؟ اور رشتے کی بات بھی لکھ دینا۔ اس طرح جواب میں تاخیر نہیں ہوگی۔''

''بالکل بالکل۔۔۔۔۔۔۔سب کچھ لکھ دیتی ہوں آج ہی۔''

زرینہ نے نوید کو خط لکھنے کا مصمم ارادہ کیا تھا۔اور اسی ارادے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے پیڈ اور قلم لے کر بیٹھ گئی۔

وہ ابھی خط شروع بھی نہ کر پائی تھی کہ ارسہ اندر آ گئی۔ارسہ کے چہرے پر اداسی کی گہری چھاپ تھی۔اور وہ ماں سے شاید اسی رشتے کے متعلق کچھ کہنے آئی تھی۔جس پر ابو پورے دل وجان سے فریفتہ تھے۔

''آؤ بیٹی۔۔۔۔۔۔۔!''زرینہ نے اپنے قریب جگہ بناتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔

وہ خاموش خاموش سی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

''میں خط لکھ رہی تھی۔''ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد زرینہ نے کہا۔

''کسے؟''وہ بولی۔

''نوید کو۔''

''کیوں؟''

''میں نے سوچا ہے کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے نوید سے بھی پوچھ لوں۔میں نے اپنی بہن سے بھی یہی کہا ہے اور تمہارے ابو سے بھی۔نوید کی ساری صورت حال سے مطلع کرتی ہوں۔اگر تو وہ تمہارے لیے سنجیدہ ہے تو واپسی جواب دے گا۔''

''اس کے جواب پر آپ۔۔۔۔۔۔۔''ارسہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

''ہاں ہاں کچھ نہیں۔اگر تو وہ سنجیدہ ہے۔اور اپنی زندگی بنانے میں پوری تندہی سے مصروف ہے'تب تو۔۔۔۔۔۔۔''

''وہ ہر بار یہی تو لکھتا ہے خالہ کو۔''

''خالہ کو لکھنے کی اور بات ہے'مجھے براہ راست لکھے گا تو بات اور ہو گی۔''

''ہوں''

''دیکھو بیٹی!میں تمہارے جذبات سے بے خبر نہیں ہوں۔لیکن نوید کی طرف سے جب تک ہمیں پوری تسلی نہ ہو جائے۔ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ہم تمہارے ماں باپ ہیں'بہی خواہ ہیں'تمہارے لیے جو سوچیں گے اچھا ہی سوچیں گے۔اتنا اچھا رشتہ محض مفروضوں کے سہارے چھوڑنا بھی عقلمندی تو نہیں۔''

ارسہ کچھ نہیں بولی اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔وہ چند لمحے سر جھکائے بیٹھی رہی۔پھر زرینہ نے اس کے سر پر شفقت سے

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں خط لکھ رہی ہوں' جواب کا انتظار کروں گی۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔ تم اداس نہ ہو۔ ہوش اور سمجھ سے کام لو۔ اگر تو نوید سنجیدہ ہے تب فیصلہ اس کے حق میں ہوگا۔ اگر سنجیدہ نہیں تو پھر تم بھی بچی نہیں' سمجھدار ہو۔ ہمارے جو قدم اٹھیں گے تمہیں ساتھ دینا ہوگا۔ بس خط کا جواب آنے تک اپنے آپ کو سنبھالو۔ ابھی ہم نے اس نئے رشتے کے لیے ہاں تو نہیں کہہ دی۔''

ارسہ نے سر ہلایا۔ پھر ماں کی طرف پورے یقین سے دیکھا۔ ''امی اپنے الفاظ پر قائم رہیے گا۔''

''تم بھی۔۔۔۔۔۔۔'' ماں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور

زرینہ کاغذ قلم سنبھال پھر خط لکھنے میں لگ گئی۔ اس نے ایک بار پھر انگلیوں پر دنوں کا شمار کیا۔ خط جانے اور آنے میں خاصا وقفہ دیا۔ پھر بڑبڑائی۔ ''پچیس تک جواب آجائے گا۔ شاید دو چار دن پہلے ہی آجائے۔ لیکن خیر پچیس تک تو آ ہی جائے گا۔''

اس نے دعائیہ جملے بھی کہے

اور

خط بند کر کے پرس میں رکھ دیا۔ وہ اسے آج ہی پوسٹ کرنا چاہتی تھی۔ زرینہ نے خط خود پوسٹ کیا۔ اور پھر وہ اور ارسہ ایک ایک دن گن گن کر کاٹنے لگیں۔

اس رات بڑا جھکڑ چلا تھا اور دھول مٹی اڑی تھی کہ سارا گھر مٹی مٹی ہو گیا تھا۔ صحن تو صحن کمرہ اور کوٹھڑی بھی مٹی سے بھر گئے تھے۔ جیراں نے صندوقوں پر کل ہی دھلے غلاف ڈالے تھے۔ اور چھتی پڑے برتن دھونے کا آج ارادہ تھا۔ کبھی کبھی اسے صفائی کرنے کا جنون سا ہو جاتا۔ چھوٹے سے گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کو بھی چمکا کے رکھ دیتی۔ کونوں کھدروں کا کوڑا نکالتی۔ چارپائیوں پر اجلی چادریں ڈالتی اور صندوقوں پر کروشیئے کی لیسیں لگے پرانے لٹھے کے غلاف صاف ستھرے کر کے ڈالتی۔

آج اسے سرے سے پھر گھر صاف کرنا پڑا۔ دھول مٹی بہت تھی۔ اس لیے اس نے سوچا پہلے چھتی کے برتن اتار کر دھو لے۔ جب تک نل میں پانی آتا رہے گا۔ وہ دھلائی کا کام کر سکتی تھی۔ اماں نے پہلے ہی سارے میلے کچیلے کپڑے نل کے پاس ڈھیر کر دیئے تھے۔

''اماں تم کپڑے دھولو۔ میں اس طرف بیٹھ کر برتن مانجھ لیتی ہوں۔ جھکڑ نے تو چھتی کے برتنوں کا ستیاناس مار دیا ہے۔''

''جیراں اچھا تھا پہلے جھاڑو لگا لیتیں۔ پھر سارا دن پڑا ہے برتن صاف کر لیتیں۔''

''اماں ابھی ابا گھر پہ ہے۔ وہ جالے پھر جھاڑو لگاؤں گی۔ جھاڑو دینے سے دھول اڑتی ہے۔ ابا اسی پر شور مچاتا ہے۔ آج تو جانتی ہو نا' جھکڑ چلا ہوا ہے۔''

''چل ٹھیک ہے' اتار لے برتن۔ تب تک میں تیرے باپ کو روٹی چائے بنا دوں۔''

''ہاں اماں''

جیراں اندر آ گئی اور چھوٹے سے کمرے کی دیوار پر بنی چھتی کے برتن اتارنے کے لیے چارپائی گھسیٹی۔

''کیا کر رہی ہے؟'' نصیر اپنی بش شرٹ کھونٹی سے اتار رہا تھا۔

''ابا برتن اتارنے ہیں' چھتی سے۔''

''کیوں؟''

''اتنی دھول پڑی ہے دیکھ تو' چینی کے برتن لگتے ہیں یہ۔۔۔۔۔۔۔؟''''

نصیر نے بش شرٹ پہنی۔ ڈاک والا تھیلا کونے میں رکھی تین پایوں والی ٹوٹی تپائی پر پڑا تھا' اٹھا کر اسے جھاڑا۔

جیراں احتیاط سے برتن اتار اتار کر چارپائی پر رکھنے لگی۔

نصیر تھیلا جھاڑ کر کمرے سے نکلنے والا ہی تھا کہ جیراں کی ''ہا'' کی آواز پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہوا؟''

''ہائے ابا'' وہ ہاتھ میں ایک پلیٹ پکڑے بولی' جس میں ایک نیلا لفافہ رکھا تھا۔

''کیا ہے؟''

''یہ۔۔۔۔۔ یہ لفافہ ابا'' وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر چارپائی سے کود کر نیچے اتری اور باپ کی طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ لفافہ اس دن اماں نے تمہاری بش شرٹ دھوئی تھی تو جیب سے نکالا تھا' میں نے پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ پھر یاد ہی نہ رہا۔۔۔۔ لو دیکھو۔''

نصیر نے اس کے ہاتھ سے نیلا لفافہ لے لیا۔ اس کے ذہن سے لندن سے آنے والا لفافہ بالکل نکل چکا تھا' اسی لیے بغیر کسی تجسس کے لفافہ جیراں سے لے لیا اور یوں ہی الٹ پلٹ کر دیکھا۔

پتے پر نظر پڑی تو اسے وہ دوپہر یاد آ گئی۔

''اوہ خدایا'' وہ سر ادھر ادھر مارتے ہوئے بولا۔

''کیا ہے ابا؟''

''یہ۔۔۔۔۔۔۔یہ خط۔۔۔۔۔۔''

''کس کا ہے؟''

''جس کا بھی ہے' تو نے کہار کھ دیا تھا بیوقوف لڑکی!''

جیراں ڈر گئی۔''بڑا ضروری خط تھا ابا؟''

''ہونہہ'' اس نے ہونٹ کاٹ کھایا۔اور پھر لفافے پر لگی مہر دیکھی۔مہر پر تاریخ لکھی تھی جو اتفاق ہی سے بڑی واضح اور صاف تھی۔

''آج۔۔۔۔۔۔آج تاریخ کیا ہے؟'' وہ پریشان سا ہو گیا۔

''انیس ہے ابا''

''اور یہ خط پچھلے ماں کی اکیس تاریخ کا آیا ہوا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔''مہینہ بھر یہیں پڑا رہا۔کتنی غلط بات ہے۔میں نے اسی دن پہنچا دیا ہوتا۔کم بخت گرمی نے مار ڈالا تھا اس دن۔''

وہ خط کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔جیراں کچھ نہ سمجھی تھی۔اسے شاید کچھ سمجھنے کا شوق بھی نہ تھا۔اسی لیے تو پھر جا چڑھی تھی اور دیسی چینی کے برتن سنبھال سنبھال کر چھتی سے اتار کر چارپائی پر رکھنے لگی تھی۔

''اے جی' ناشتہ کر لو۔جانا نہیں آج ڈاک خانے۔۔۔۔۔۔۔؟'' اس کی بیوی نے صحن کے کونے میں بنے چھپر تلے سے مٹی کے چولہے پر چائے کی دیگچی اتارتے ہوئے آواز دی۔

نصیر ہاتھ میں نیلا لفافہ لیے اس چھپر کی طرف آ گیا۔

اس کی بیوی نے پیڑھی اور چوکی برابر کر کے رکھی۔چنگیر میں روٹی اور پیالی میں تھوڑا سا چینی ملا دہی رکھ کر کہا۔''لو کھا لو' چائے بھی پکی ہوئی ہے۔روٹی کھا لو تو ڈالوں پیالے میں۔'' وہ اب بھی لفافے کو تکے جا رہا تھا۔

''یہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔خط ہے کسی کا یا اپنا کہیں سے آیا ہے؟'' بیوی نے پوچھا۔

''پچھلے ماہ کا آیا ہوا ہے' میری شرٹ کی جیب میں تھا۔''

''اچھا۔۔۔۔۔۔''

''جیراں نے نکال کر چھتی پر رکھ دیا تھا' پگی نے پھر بتایا ہی نہیں' خود مجھے بھی یاد نہ رہا اور آج اس خط کو آئے مہینہ ہونے کو ہے۔''

''تمہارا ہے۔''

''نہیں' میرا کون لندن میں بیٹھا ہے؟''

''لندن کا خط ہے؟''

''ہاں' پتہ نہیں کتنا ضروری ہوگا۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی' مجھے اسی دن دے کے آنا چاہیے تھا۔''

''اب دے آؤ نا''

''اب تو دے کر آؤں گا ہی۔''

''پھر افسوس کس بات کا' کبھی دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ تم نے جان بوجھ کر تو دیر نہیں کی۔''

''ایک طرح سے جان بوجھ کر ہی کی ہے۔''

''کیسے؟''

نصیر نے اس دن کا واقعہ بیوی کو کہہ سنایا۔ بیوی سن کر نہ تو سنجیدہ ہوئی نہ ہی کسی قسم کے پچھتاوے کا اظہار کیا' بلکہ بولی۔ اچھا ہی کیا تھا۔ بغیر سائیکل کے اتنی تیز دھوپ میں پیدل وہاں تک جاتے آتے تو لو لگ جاتی تمہیں' بیمار پڑنا تھا۔ ایک خط ہی ہے نا' تب نہ پہنچا اب پہنچ جائے گا۔ چھوڑو اسے' لو روٹی کھالو۔ اب خط کے فکر میں روٹی نہ چھوڑ جانا۔۔۔۔۔۔۔ بیٹھو۔''

نصیر پیڑھی پر بیٹھ کر روٹی زہر مار کرنے لگا۔ وہ بڑا فرض شناس آدمی تھا۔ اسے اپنی کوتاہی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ اسی خط کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کیا پتہ کتنا ضروری خط ہو۔ اس نے بھول سے اتنی تاخیر کر دی۔ خط ضروری نہ بھی ہو تو بھی اس کا فرض تو تھا کہ خط دوسرے دن پہنچا دیتا۔

وہ اپنی غلط پر پچھتا رہا تھا۔ جانتا تھا کہ بعض اوقات چھوٹی سی غلطی بے ضرر سی بھول اور معمولی سی کوتاہی بھی بڑے بڑے سنگین نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ کام بگڑ جاتے ہیں' مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں' معاملے الجھ جاتے ہیں۔''

نصیر نے روٹی کھا کر چائے سڑپ سڑپ پی۔ مٹی کا خالی پیالہ چوکی پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ نیلا لفافہ اس نے جیب میں ڈال لیا۔

وہ دیوار سے لگی کھڑی اپنی سائیکل کی طرف آیا۔ کم بخت اس سائیکل نے ہی اسے اپنا فرض ادا کرنے سے روکا' نہ یہ بگڑتی نہ وہ کوتاہی کرتا۔ خیر۔۔۔۔۔۔۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔۔۔۔۔۔۔ پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بہتری اسی میں تھی کہ وہ اپنے حلقے کی

ڈاک تقسیم کرنے سے پہلے یہ خط اس کالونی میں پہنچا آئے۔ دو تین میل کا فالتو چکر تھا جسے اس نے سزا کے طور پر قبول کر لیا۔

سائیکل لے کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو اس کے چھوٹے بچے پیچھے بھاگے۔ کسی نے سواری کرنے کی فرمائش کی۔ کوئی ٹانگوں سے لپٹ کر بولا۔ ''ابا اک اٹھنی دے دو۔'' کسی نے بسکٹ لانے کی فرمائش کی۔

''اچھا اچھا'' وہ سب کو ہٹاتا سائیکل باہر گلی میں لے آیا۔ بچے گلی تک اس کے پیچھے لپکے۔

''کم بختو ہٹو بھی جانے بھی دو مجھے۔'' اس نے خلاف معمول بچوں کو جھڑکا۔ تو بچے سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔

وہ ڈاک خانے پہنچا تو ڈاک کی چھانٹی ہو رہی تھی۔ اسے کچھ وقت اپنے حلقے کی ڈاک الگ کرتے لگ گیا۔ پھر اس نے لفافے خط اور کارڈ اپنے تھیلے میں ڈالے۔ کچھ رسائل اور کتابوں کے پیکٹ تھے وہ اٹھائے۔ دو منی آرڈر بھی دینے تھے۔ وہ بھی لیے پیسے گن کر جیب میں ڈالے اور پھر باہر نکل کر سائیکل کی طرف آیا۔

اتنے کام میں وہ نیلے لفافے کو نہیں بھولا تھا۔ وہ چاہتا تو اکرم کو لفافہ دے دیتا۔ ان دنوں ادھر کی ڈاک اکرم بانٹتا تھا۔

لیکن

اس نے لفافہ اسے نہیں دیا۔ یہ لفافہ اس نے خود دینے جانا تھا۔ اور اپنی غلطی اور کوتاہی کے لیے معذرت بھی کرنا تھی۔ یہ اخلاقی فرض تھا۔ وہ ویسے ہی خط ڈال آتا تو بھی اسے پوچھنے والا کوئی نہ تھا' لیکن وہ جرم کا سا احساس اپنے من میں پا رہا تھا۔ اس لیے چاہتا تھا کہ خط ارشد صاحب کے گھر دے کر معذرت بھی کر دے۔ اس کا نتیجہ اس کے حق میں ضرر رساں بھی ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ اسے ڈانٹ بھی سکتے تھے۔ برا بھلا بھی کہہ سکتے تھے۔ اس کی شکایت بھی کر سکتے تھے۔ جو اس کی نوکری کے لیے ضرر رساں بھی ہو سکتی تھی۔

لیکن

ضمیر کا بوجھ بھی تو تھا' جو وہ اتارنا چاہتا تھا۔

کوٹھی کے سامنے والے میدان میں لگے شامیانے اتارے جا رہے تھے۔ رنگا رنگ کرسیوں کو اوپر تلے رکھ کر وین میں رکھا جا رہا تھا۔ کراکری بڑے بڑے ٹبوں میں رکھی جا رہی تھی۔ ٹینٹ سروس والے آئے ہوئے تھے۔

کوٹھی کے ماتھے پر سجی رنگین قمقموں کی لڑیاں سمیٹی جا رہی تھیں اور مرکری ٹیوبیں اکھیڑی جا رہی تھیں۔

نصیر' ارشد صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو زرینہ وہیں کھڑی تھی۔ وہ بجلی کی تاریں احتیاط سے اتارنے کی تاکید کر رہی تھی۔ ارشد صاحب رنگین ٹینٹوں کے پاس کھڑے تھے۔

نصیر نے زرینہ کو سلام کیا۔ وہ من ہی من میں کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ وہ جیب سے خط نکال رہا تھا کہ زرینہ نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔ ''اب تو ادھر ڈاک کوئی اور لاتا ہے۔''

''ہاں بیگم صاحب جی' میرا حلقہ بدل گیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''آج کیسے آئے؟''

''جی۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔''

''ہماری بیٹی کی شادی کا پتہ چلا ہوگا۔'' زرینہ نے قدرے مسکرا کر کہا۔ وہ کبھی کبھی نصیر کو بخشیش دیا کرتی تھی۔

''جی نہیں۔۔۔۔۔۔۔میں تو یہ خط۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے خط جیب سے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''بیگم صاحب جی یہ خط۔۔۔۔۔۔۔''

نیلا لفافہ دیکھتے ہی زرینہ ادھر متوجہ ہوئی۔ جلدی سے اس کے ہاتھ سے لفافہ لیا اور اس سے بھی جلدی سے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

''نوید کا ہے۔'' وہ خود بھی بڑبڑائی۔ ''اب۔۔۔۔۔۔۔اب آیا ہے جواب۔۔۔۔۔۔۔''

نصیر شرمساری اور ندامت سے سائیکل کی گدی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''وہ جی خط تو پچھلے ماہ کی اکیس کا آیا ہوا ہے۔''

''کیا۔۔۔۔۔۔۔؟'' زرینہ کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

''جی''

زرینہ نے جلدی سے مہر دیکھی۔ پھر پھٹی پھٹی حیران نظروں سے نصیر کو دیکھ کر بولی۔ ''پچھلے ماہ کی اکیس کا خط آج۔۔۔۔۔۔۔لائے ہو؟''

''وہ۔۔۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔۔۔۔''

''ڈاک کی گڑبڑ۔۔۔۔۔۔۔تھی۔۔۔۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔۔۔تمہاری تبدیلی۔۔۔۔۔۔۔'' وہ لفافہ پکڑے پکڑے بولی۔ اس کا ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

نصیر کچھ کہنے ہی کو تھا کہ ارشد صاحب ادھر آ گئے۔ زرینہ بے اختیارانہ انداز میں ان کی طرف لپکی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نوید کا خط۔۔۔۔۔۔۔''

''اب آیا ہے؟'' ارشد صاحب بے رخی سے بولے۔

''اب نہیں' پچھلے ماہ کی اکیس کا آیا ہوا ہے' یہ۔۔۔۔۔۔۔ یہ اب لایا ہے۔'' اس نے نصیر کی طرف اشارہ کیا۔ ''مس پلیس ہو گیا تھا شاید۔۔۔۔۔۔۔''

نصیر زرینہ کی پریشانی اور انداز سے سمجھ گیا کہ یہ خط انتہائی ضروری نوعیت کا تھا۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ بڑی ندامت ہوئی۔ اپنی کوتاہی پر بے طرح پچھتاوہ آیا۔

وہ کچھ کہنے کو الفاظ ہی موزوں کر رہا تھا کہ ارشد صاحب بولے۔ ''اکیس کو آیا ہے یا بائیس کو۔۔۔۔۔۔۔ اب کیا فائدہ؟''

وہ بھی کچھ اداس سے نظر آئے۔ زرینہ تو بہت ہی دکھی اور پریشان لگی۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔ اب کیا فائدہ۔۔۔۔۔۔۔ اقرار ہو تب بھی' انکار ہو تب بھی'' زرینہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

اور

پھر

بنا لفافے کھولے

لفافے کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دیئے۔

نصیر

کچھ نہ کہہ سکا' کچھ نہ بولا

معاملے کی سنگینی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

واقعی

بعض اوقات

چھوٹی سی بھول' بے ضرر سی غلطی اور معمولی سی کوتاہی بڑے بڑے سنگین نتائج کی راہیں ہموار کر دیتی ہے۔ یہاں بھی کوئی بڑی سنگین سی گڑبڑ ہو چکی تھی۔

نصیر یہی سوچتے واپس لوٹ گیا۔

◆◆◆

ہار جیت

اس نے کئی سٹور کھنگال ڈالے لیکن نیرا کے لیے وہ تحفہ نہ خرید سکا' جو خریدنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے لاجواب اور نایاب سی شے خریدنے کی تمنا دل میں لیے ان بڑے بڑے اسٹوروں میں کئی دنوں سے گھوم پھر رہا تھا۔ وہ ایسی چیز خریدنے کا متمنی تھا جو اس کے دل کی بات نیرا تک پہنچانے کی امین بھی ہو۔ نیرا کے ذوق پر بھی پوری اترے اور وہ اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑے۔ اس کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی کو داد کے طور پر وصول کرنے کی ہی تو اسے لگن تھی۔

اس نے کئی خوبصورت اور قیمتی چیزیں خریدیں تھیں۔ تین سال کے بعد وہ وطن واپس لوٹ رہا تھا۔ گھر کے ایک ایک فرد کے لیے اس نے تحفے خریدے تھے۔ دوستوں کے لیے چیزیں خریدیں تھیں۔ رحمان چچا اور زینب چچی کے لیے بھی تحائف لیے تھے۔ لیکن ابھی تک نیرا کے کچھ خرید نہ پایا تھا۔ انتخاب ہی نہ ہو پایا تھا۔ اس دن وہ چھوٹے بڑے لفافے اور کاغذی بنڈل لیے اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ چیزیں بھی الگ الگ کر کے رکھ ہی رہا تھا کہ اس کا دوست نعیم آ گیا۔

آتے ہی بولا۔ ''یار تیری خریداری ابھی ختم ہوئی یا نہیں۔ پورا نیویارک ہی اٹھا لے جاؤ گے۔''

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہولے سے مسکرا کر کہا۔ ''شاپنگ تو کر لی' لیکن خاص الخاص شے تو خرید ہی نہیں پایا۔''

''خاص الخاص شے؟''

''ہاں''

''اس سے مطلب کیا ہے تمہارا؟''

وہ ایک خوبصورت سی مسکان لبوں پر لیے نعیم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''خاص الخاص یعنی خاص الخاص بس۔۔۔۔۔۔''

اس کی آنکھوں سے محبت کی ضو پاشی ہو رہی تھی۔ نعیم کو سمجھتے دیر نہ لگی۔ ''اچھا تو تمہارا مطلب اپنی اس گرل فرینڈ کے۔۔۔۔۔۔''

''شٹ اپ'' وہ ہنس کر بولا۔

''کیوں؟''

''گرل فرینڈ کہہ رہے ہو میری نیرا کو۔''

''اوہ سوری۔۔۔۔۔۔۔تو اپنی چچازاد بہن کے لیے۔''نعیم نے جان بوجھ کر''بہن'' پر زور دیا تو جمیل نے ہاتھ میں پکڑا پیکٹ اونچا کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''پھر بہن کہا تو یہ تیرے سر پر دے ماروں گا۔''

نعیم نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے بچاؤ کے لیے اٹھاتے ہوئے کہا۔''تو پھر کیا کہوں اسے'بہن۔۔۔۔۔۔''

''بہن تیری ہے۔''

''اوں ہوں۔۔۔۔۔۔۔میری بہن نہیں وہ۔''

''تو کیا ہے؟''

''ہونے والی بھابی۔۔۔۔۔۔''

جمیل ہنس پڑا۔''یہ ہونے والی ٹھیک کہا تم نے۔''

''صرف یہی کہہ سکتے ہو نا۔۔۔۔۔۔۔بہن تم اسے مانتے نہیں'گرل فرینڈ کہنا بھی پسند نہیں کرتے'منگیتر وہ ابھی تمہاری بنی نہیں' محبوبہ کہتا تو بڑا چیپ لگتا۔۔۔۔۔۔۔صرف یہی کہہ سکتا تھا۔''

''کافی عقلمند لگتے ہو۔''

''شک ہے کیا؟''

''اچھا یار عقلمندی کا مظاہرہ تم ہی کر کے دکھاؤ۔''

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ میں تو ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ نیرا کے لیے کون سی چیز لے جاؤں۔''

''اسٹوروں کے اسٹور بھرے پڑے ہیں اور تم ابھی انتخاب ہی نہیں کر پائے۔''

''بات یہ ہے کہ میں اسے ایسی چیز دینا چاہتا ہوں جو میرے جذبوں'امنگوں اور تمناؤں کی عکاسی بھی کرے اور نیرا کو پسند بھی آ جائے۔اسے پا کر وہ خوشی سے پاگل ہو جائے۔''

''نہ۔۔۔۔۔۔۔نہ۔۔۔۔۔۔۔شادی سے پہلے ہی پاگل ہو گئی تو۔۔۔۔۔۔''

''مذاق چھوڑو بتاؤ کیا لے جاؤں اس کے لیے؟''

''یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں۔''

''ہے۔۔۔۔۔۔۔میرے لیے تو ہے' اسی لیے تو ابھی تک چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ اس کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں خرید سکا۔''

''بالکل بے وقوف ہو۔''

''عقلمند صاحب' میری مشکل تم ہی حل کردو۔''

''معمولی بات۔۔۔۔۔۔۔ایک خوبصورت' نفیس اور ننھی سی چمکتی دمکتی سی انگوٹھی خرید لو۔''

سجیل انگوٹھی کے نام پر اچھل پڑا۔ انگوٹھی کے متعلق تو وہ کافی دنوں سے سوچ رہا تھا۔ لیکن انگوٹھی تو اٹوٹ بندھن کی نشانی ہوتی ہے۔ اور اسے باہمی رضامندی اور والدین کی رضامندی سے ہی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ اتنا بڑا قدم وہ اپنے طور پر کیسے اٹھا سکتا تھا۔

''اس کے متعلق میں نے بہت سوچا ہے۔''

''تو خریدی کیوں نہیں' پیسے نہیں ہیں تو مجھ سے لے لو۔''

سجیل ہنس کر بولا۔''پیسوں کی میرے پاس کمی نہیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ کتنی اچھی جاب ملی ہے مجھے۔ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ قیمتی سے قیمتی انگوٹھی خرید سکوں۔''

''تو پھر کیا تکلیف ہے؟''

''یار یہ پریزنٹ سمبالک ہوتا ہے۔''

''بالکل''

''اسی لیے تو میں نہیں لے رہا۔''

''کیوں کسی گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔۔۔۔۔۔۔نیر اتمہارے رحمان چچا کی بیٹی ہے نا؟''

''ہاں' ان کا تمہارے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''ظاہر ہے اچھا ہی ہے۔''

''تمہارے والدین نیرا کو پسند کرتے ہیں؟''

''پسند معمولی لفظ ہے۔''

''تو پھر کیا تکلیف ہے تمہاری تو کچھ سمجھ نہیں آتی مجھے' اب تم ذمہ دار آدمی ہو' اسٹوڈنٹ نہیں ہو کہ کوئی اعتراض کی گنجائش نکلے۔ اتنی اچھی پوسٹ پر ہو' کچھ کچھ شریف ہو اور تھوڑے تھوڑے ہینڈسم بھی۔'' نعیم نے شوخی سے کہا تو سجیل نے دھپ سے اس کے کندھے پر مکہ جما ہی دیا۔

''کیوں بے کچھ کچھ شریف ہوں؟ تین سال سے میرے ساتھ رہ رہے ہو۔ تمہارے کرتوتوں کا مجھ پر سایہ تک نہیں پڑا۔ اور ہینڈسم کیا کم ہوں میں۔۔۔۔۔۔۔؟'' سجیل نے سینہ تان کر اپنی خوبصورتی کے مظاہرے کی کوشش کی۔

پھر دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''اچھا تو ان ساری خوبیوں کے باوجود خدشہ کاہے کا ہے؟'' سجیل کی ٹھوڑی ہلاتے ہوئے نعیم نے کہا۔

''ہے تو نہیں۔''

''یہ تمہارے ڈھکے ڈھکے لیکن بمبار قسم کے عشق کی نیرا کو خبر بھی ہے یا نہیں؟'' نعیم نے پوچھا تو سجیل مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پتہ نہیں۔''

''ہت ترے کی۔۔۔۔۔۔۔ یکطرفہ عشق ہی فرما رہے ہو۔''

''نہیں' نیرا بھی۔۔۔۔۔۔۔''

''یعنی نیرا بھی تمہیں پیار کرتی ہے؟''

اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ پھر آہستگی سے بولا۔ ''لیکن ہم نے ایک دوسرے پر اپن بے پایاں پیار کا کھل کر اظہار کبھی نہیں کیا تھا' اظہار۔۔۔۔۔۔۔ ہاں کبھی کھل کر نہیں کیا تھا' اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔''

''پھر تمہیں کیسے پتہ کہ وہ بھی تمہیں چاہتی ہے۔''

''چغد کہیں کے۔۔۔۔۔۔۔ پیار ناپنے جانچنے کے اپنے ہی آلے ہوتے ہیں۔ جذبوں کی حدت اور آنچ محسوس کی جاتی ہے۔ نگاہیں بولتی نہیں۔ لیکن پیار کی زبان بڑی روانی سے سمجھا دیتی ہیں۔ جذبے بے زبان ہوتے ہوتے ہوئے بھی بات چیت کے سارے سلیقے جانتے ہیں۔''

نعیم اس کی شاعرانہ باتوں پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''تم جیسے ایک سینے میں ہزاروں دل رکھنے والے ان نفاستوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔'' سجیل نے اس پر مسکراتی طنز اچھالی۔

''واقعی۔۔۔۔۔۔۔ہم تو ان محبتوں کے جالوں میں الجھتے نہیں' جو لڑکی سامنے آئی' اگر بھا گئی تو کچھ عرصہ اس کی محبت میں ہنسی خوشی گزار لیا۔''

''اور اس سے اچھی مل گئی تو پہلی سے طوطا چشمی کر کے دوسری کو پکڑ لیا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولا۔''کم از کم یہاں رہ کر یہی ہوتا ہے۔دوسری کے بعد تیسری' تیسری کے بعد چوتھی۔''

''توبہ توبہ۔۔۔۔۔۔۔کیسے آدمی ہو۔''

''اس دور کا آدمی ہوں' موقعہ پرست۔تمہاری طرح دقیانوسی نہیں کہ ایک ہی کو دل و دماغ پر مسلط کر رکھا ہے۔اس سے لاکھوں کوس دور بیٹھ کر بھی اسی کے تصور سے دل بہلاتے رہتے ہو۔۔۔۔۔۔۔بھئی'' اس نے کندھے اچکا کر منہ بناتے ہوئے کہا۔''ہم تو عملی آدمی ہیں' محبت ہوئی تو بے دھڑک اظہار کر ڈالا' بس۔۔۔۔۔۔۔''

سجیل ہنس کر بولا۔''محبت اور جذباتیت میں تمیز کرنا سیکھو پہلے۔''

''اگر پاکستان گیا تو ضرور تمہاری شاگردی کر لوں گا' یہاں چلے گا۔'' وہ ہنس پڑا۔

دونوں دوست کچھ ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔محبت کے نظریے میں دونوں میں اختلاف تھا۔سجیل اظہار کے مخالف تو نہیں تھا۔لیکن محبت کی نزاکتوں اور نفاستوں کے پیش نظر اظہار کا بھی اس کا اپنا ہی نظریہ تھا۔نعیم اس کی بات کو لغو قرار دے رہا تھا۔

''اظہار کے بنا چاہت کا مزہ ہی کیا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔''محبت ہو جائے تو اظہار کے برتاؤ کے تابڑ توڑ حملے کر دو۔''

سجیل اس کی باتیں سکون سے سن رہا تھا' مسکرا بھی رہا تھا' لیکن جو نظریہ اس نے قائم کیا ہوا تھا اس سے سرمو ادھر سے ادھر نہیں ہوا تھا۔

نیرا اس کے رحمان چچا کی چھوٹی بیٹی تھی۔اس سے سات آٹھ سال چھوٹی تھی۔رحمان چچا اور وہ سب لوگ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔یہ حویلی نما کوٹھی اس کے دادا نے بنوائی تھی۔دو الگ الگ پورشن ہوتے ہوئے بھی کوٹھی ایک ہی تھی۔سجیل کے والد عثمان بڑے تھے رحمان چھوٹے۔ان سے چھوٹی دو بہنیں تھیں۔دونوں بیاہی جا چکی تھیں۔دونوں بھائی اکٹھے ہی رہتے تھے۔پہلے تو کھانا پینا بھی ایک ہی جگہ تھا۔لیکن جب سے دونوں بھائیوں کے بچے بڑے ہو گئے تھے۔کچن میں الگ ہو گئے تھے۔

عثمان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سجیل سب سے بڑا تھا۔ دوسرے نمبر پر راحیل تھا۔ پھر جینا اور مرینہ تھیں اور سب سے چھوٹا شکیل تھا۔

رحمان کے دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ نیرا سب سے چھوٹی تھی۔ سنہری مائل سیاہ بالوں اور بھوری بھوری آنکھوں والی نیرا کو خدا نے دلکشی اور حسن سے بطور خاص نوازا تھا۔ بے حد پرکشش تھی' رنگت سنہری تھی' چینی عورتوں کی سی نفاست بھی تھی۔ اس میں شوخ اور چنچل بھی تھی۔ بڑے بھائی سلمان اور بہن دینا کی بڑی لاڈلی تھی۔ لیکن اپنے سے بڑے یعنی دوسرے بھائی عرفان سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ دونوں میں اکثر لڑائی جھگڑا رہتا۔ لیکن جب بھی لڑائی کی شکایت بڑوں تک پہنچتی۔ پلڑا نیرا ہی کا بھاری رہتا۔

دونوں خاندانوں کی آپس میں خوب بنتی تھی۔ بھائیوں اور ان کی بیویوں کا اتنا پیار اور اتفاق تھا کہ لوگ ان کے گھرانوں کی مثالیں دیتے تھے۔ رحمان اور ان کی بیوی زینت' عثمان اور ان کی بیوی عائشہ کی عزت اور قدر بالکل اسی طرح کرتے تھے جس طرح بچوں کے والدین کرتے تھے۔ سارا خاندان محبت اور پیار سے رہتا تھا۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے برابر کے شریک تھے۔ جو کام بھی کرنا ہوتا ایک دوسرے کی صلاح مرضی سے ہوتا تھا۔ بچوں کے رشتے ناتے کرنے کی عمریں بھی ہوگئی تھیں۔ نیرا سے بڑی دینا کا رشتہ شاہدہ پھوپھو کے بیٹے سے ہوا تھا۔ بیٹی رحمان کی تھی' لیکن سارے اختیارات رحمان نے بڑے بھائی کو سونپ دیئے تھے۔ انہوں نے ہی یہ رشتہ بہن کو دیا تھا۔ سلمان کی منگنی بھی خالہ کے ہاں ہوئی تھی۔ اس پر بھی رضامندی کی مہر عثمان ہی نے لگائی تھی۔ عرفان کے رشتے کا ارادہ اپنی جینا سے کرنے کا تھا۔

سجیل کا رشتہ طے تو نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں ابھی کہیں بات چلی تھی۔ نیرا اس سے کافی چھوٹی تھی' اس لیے یہاں رشتہ طے کرنے کا کسی کے ذہن میں خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ہاں' سجیل نیرا کو برسوں سے چپکے چپکے چاہے چلا جا رہا تھا۔

بی اے اچھی اور اعلیٰ پوزیشن میں پاس کرنے کے بعد سجیل کو ایم بی اے کرنا تھا۔ اس نے امریکہ جا کر یہ ڈگری لینے کی خواہش ظاہر کی۔ ابا تو ہونہار بیٹے کی بات مان گئے لیکن امی نے شور مچایا۔

''یہاں بھی ایم بی اے کیا جا سکتا ہے۔ اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بچے کو خراب کرنا ہے۔ وہاں جا کر تعلیم تو بھول جائے گا اور رنگ رلیوں میں ضرور لگ جائے گا۔''

اماں نے تو اتنی مخالفت کی کہ سجیل بے چارے کی بات بنتے بنتے رہ گئی۔ وہ شاید ابا کے سہارے امی کو بھی راضی کر لیتا۔ لیکن اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ نیرا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا تھا۔ ''سجیل بھائی اتنی دور چلے جاؤ گے؟ ہمارا تو دل ہی نہ لگے گا آپ کے

بغیر۔۔۔۔۔۔ سچی' نہ جایئے۔۔۔۔۔۔۔یہیں داخلہ لے لیں نا' آپ کے بغیر تو سب اداس ہو جائیں گے۔''

ان دنوں نیرا تیرہ چودہ سال کی تھی۔اس نے جو کچھ کہا تھا بغیر لگی لپٹی اور خلوص سے کہا تھا۔لیکن سجیل کا دل تو خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا تھا۔نیرا اس کے بغیر اداس ہو جائے گی' اس کا دل نہیں لگے گا۔وہ اسے اتنی ذہنی تکلیف کیونکر دے سکتا تھا۔

اس نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اور

اس دن جب نیرا سامنے والے بڑے دالان میں ریکٹ لیے اپنے ساتھیوں کو کھیلنے کے لیے جمع کر رہی تھی وہ چپکے چپکے اس کے پاس آیا اور ہولے سے بولا۔''ایک خوشخبری سناؤں تمہیں؟''

''سنایئے''

''میں نے امریکہ جانے کا خیال ترک کر دیا ہے۔''

''سچی؟''

''ہاں''

''اوہ' آپ کتنے اچھے ہیں۔۔۔۔۔۔''

''سچ مچ اچھا ہوں؟''

''بالکل''

''جھوٹ تو نہیں کہہ رہے۔''

''نہیں نہیں' پورے ایمان سے سچ کہہ رہی ہوں۔آپ بہت اچھے ہیں' سب سے اچھے۔سلمان بھائی اور عرفان بھائی اور راحیل' سب سے اچھے ہیں۔''

''یقین کر لوں۔''

''اب نہ کریں تو آپ کی مرضی' ہم نے تو سچی بات کہہ دی۔''

سجیل کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ لپک کر ادھر آ گئی' جدھر اس کے ہم عمر لڑکے لڑکیاں کھیلنے کے لیے چلے آ رہے تھے۔

سجیل سرشار سرشار سا اندر چلا آیا۔

سجیل نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا اور کامیابی سے یہ امتحان پاس کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ دو تین سال چھوٹی موٹی نوکریاں کیں' لیکن پھر امریکہ جا کر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ اپنا مستقبل سنوارنے کی اسے خواہش تھی۔

اس دفعہ نیرا نے مخالفت نہیں کی۔ بلکہ امی کی مخالفت کے باوجود اس نے سجیل سے کہا کہ وہ ضرور امریکہ جائے۔ اب وہ تھرڈ ائیر میں تھی۔ سوچ سمجھ بالغ ہو چکی تھی۔ جس جس چیز میں بہتری کی توقع تھی' اسے کر گزرنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔''

امی تو اب اس کے سہرے کے پھول دیکھنے کی متمنی تھیں۔ باہر جانے پر رضامند کیسے ہوتیں۔

''لیکن امی شادی تو تب ہوگی' جب اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ ان چھوٹی موٹی نوکریوں کی آمدنی پر تو میں شادی کرنے کا نہیں۔''

امی سمجھدار تھیں' بولیں۔ ''تو کون شادی کرے گا اس نوکری میں' پہلے اچھی نوکری تلاش کر پھر۔۔۔۔۔۔''

''اچھی نوکری تو اچھی ڈگری سے ملے گی۔''

''ایم بی اے نہیں کر چکا۔۔۔۔۔۔''

''امریکہ سے ڈگری لوں تو بہت اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ اور ہاں امی' اب تو میں سمجھدار ہو گیا ہوں نا' اچھے برے کی پہچان ہو گئی ہے۔ اب امریکہ گیا تو تعلیم ہی کو اولیت دوں گا۔ رنگ رلیوں میں نہیں پڑوں گا۔ یہ ایک سچا وعدہ ہے آپ سے۔''

امی اس کی باتوں سے مرعوب ہو گئیں۔ وہ روز ہی ایسی باتیں کرتا تھا۔ نیرا اس کی پشت پناہی کر رہی تھی۔

اس دن نیرا نے کہا۔ ''نہیں ملی اجازت؟''

''مل جائے گی۔''

''میں دلا دوں؟''

''بڑا زعم ہے۔''

''بالکل''

''اچھا''

''تائی اماں کی لاڈلی ہوں میں' میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔''

''کہہ دیکھو۔''

''اچھا''

نیرا نے اسے امریکہ جانے کی اجازت دلانے کا وعدہ کرلیا' وہ خوش ہوگیا۔

''اگر اجازت دلادی تو کیا دو گے؟'' نیرا نے شوخی سے پوچھا۔ بجیل نے بڑی ہمت کر کے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

''کیا لوگی؟''

وہ ہنس کر بولی۔ ''تمہیں''

''نیرا۔۔۔۔۔۔!'' بجیل نے بے اختیارانہ ہاتھ پھیلا دیئے۔ لیکن وہ اک ادائے دل فریبی سے ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

امی' جانے بجیل کی خوشی کی خاطر مان گئیں یا نیرا نے ہی انہیں اجازت دینے پر مجبور کر دیا۔ بہر حال بجیل نے داخلہ لے لیا اور خوشی خوشی جانے کی تیاری میں لگ گیا۔ اس تیاری میں نیرا نے بھی اس کی مدد کی۔

بجیل کے دل میں نیرا کی محبت نے بچپن ہی سے جڑیں پکڑ لی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ پودا پروان چڑھ رہا تھا اور اب تو یہ ایک گھنا اور چھتنار درخت بن چکا تھا۔ اس درخت کا سایہ اور چھاؤں نیرا اور اس کی ہستی پر محیط تھی۔ لیکن بجیل نے کبھی اظہار محبت نہیں کیا تھا۔

اس کی ضرورت یوں بھی نہ تھی کہ چاہتوں اور جذبوں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ جو اپنا مفہوم پوری طرح سمجھا دیتی ہے۔ بجیل بھی یہ مفہوم نیرا کو سمجھا چکا تھا۔ الفاظ کی محتاجی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ نیرا کی محبت بھی بے زبان سہی لیکن ڈھکی چھپی تو نہ تھی۔ اس کا اظہار اس کی حرکات سے کئی بار ہو چکا تھا۔

تین برس پہلے بجیل اسکوٹر سے گر گیا تھا اور اس کی ٹانگ کی ہڈی پر ضرب لگ گئی تھی تو رو رو کر نیرا نے برا حال کر لیا تھا۔ جتنے دن وہ ہسپتال میں رہا' وہ اسکول نہیں گئی۔ دن سے رات تک ہسپتال میں اس کے بیڈ کے ساتھ جڑی بیٹھی رہی۔

''نیرا تھک جاؤ گی' کچھ دیر آرام کرنے گھر چلی جایا کرو۔'' بجیل نے ایک دن اسے کہا تھا۔

''تم ہسپتال میں پڑے رہو اور میں گھر جا کر آرام کروں۔''

''میری تو ٹانگ ٹوٹی ہے' مجبوری ہے۔''

''میری بھی مجبوری ہے۔''

''کیا۔۔۔۔۔۔؟''

وہ اس کا جواب تو نہ دے سکی' ہاں کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا تھا کہ وہ اندر ہی اندر غبار کی طرح پھول گیا تھا۔

اور ایک دفعہ جب نیرا کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ پورے دو ماہ بیمار رہی تھی۔ یہ دو ماہ سجیل نے جس طرح گزارے تھے' جس طرح اس کی تیمارداری کی تھی۔۔۔۔۔۔۔ وہ ایک مثال تھی۔ نیرا بھی تو صرف اسی پر انحصار کرنے لگی تھی۔ اسی کے ہاتھ سے دوائی لیتی' اسی کے ہاتھ سے کھانا کھاتی' آدھی رات کو چیخنے لگتی۔ ''سجیل بھائی کو بلاؤ۔''

سجیل تو جیسے اس کی آواز کو پکارنے سے پہلے ہی سن لیتا تھا۔ سو رہا ہوتا' گہری نیند ہوتی لیکن وہ اس پکار پر آپوں آپ جاگ اٹھتا تھا۔

نیرا کے گھر میں اپنے بھائی بہن بھی تھے' سجیل کے گھر بھی اور لوگ تھے' لیکن لگتا تھا وہ سجیل کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کرتی۔ صرف سجیل کی تیمارداری پر اسے اعتماد تھا۔

دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ صبح و شام کی کوئی قید نہ تھی۔ جب چاہتے مل بیٹھتے۔ نیرا اپنی پڑھائی کے مسائل اسی سے حل کرواتی۔ وہ بھی ہمہ وقت اسے مدد دینے کو تیار رہتا۔ جب سے اس نے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اس کو ٹیوشن کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ پڑھائی میں کچھ زیادہ تیز نہ تھی۔ یہ ٹیوشن سجیل ہی کے ذمہ تھی۔ وہ اتنے دلنشیں انداز میں اسے پڑھاتا' سمجھاتا کہ نیرا جھٹ سے کہتی۔ ''جی چاہتا ہے کالج جانا ہی چھوڑ دوں۔ اللہ قسم سجیل بھائی یہی سوال مس نے بھی مجھے سمجھایا' لیکن پلے کچھ نہیں پڑا' اسے پڑھانا آتا ہی نہیں۔''

اس کی باتوں پر سجیل مسکرا کر کہتا۔ ''اچھی بات ہے جو سمجھاتا ہوں' سمجھ جاتی ہو' مجھ سے بھی نہ سمجھ پاتیں تو۔۔۔۔۔۔''

''تو کیا کرتے؟''

''دو چار تھپڑ جڑ دیتا۔ کند ذہنی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''اچھا جی''

''ہاں جی''

دونوں ہنس پڑتے۔ نیرا کی نقرئی گھنٹیوں جیسی ہنسی سجیل کے کانوں میں رس گھول دیتی۔

اس دن سجیل نیرا کو پڑھا رہا تھا۔ دونوں لان میں کین کی میز پر کتابیں رکھے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ موسم بے حد خوبصورت تھا۔ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم کی خنکی رومانوی ہو گئی تھی۔ ہوائیں کلیوں پھولوں کے چپکے منہ چوم جاتی تھیں۔

نیرا کا دھیان پڑھائی سے زیادہ موسم کی سحر خیزی کی طرف تھا۔ اٹھارہ سالہ لڑکی جس کے ذہن' دل و دماغ میں ہر وقت ایک ہلچل سی مچی رہتی تھی' جو بھاری ہاتھوں کے لمس کی لذت محسوس کر سکتی تھی' جو بوجھل آواز کے سحر میں ڈوب سکتی تھی۔ جو تصوراتی شہزادے کو وجود دینے کی منزل میں تھی۔ اور جس کے روبرو ایک خوبصورت نوجوان اس وجودی خول میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ وہ کیسے اطمینان سے پڑھ سکتی تھی۔ سکون سے سوال سمجھ سکتی تھی۔

''سمجھ آیا؟'' سجیل نے اس کی نظروں کی غیر حاضری محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں''

''پھر سمجھاؤں؟''

''نہیں''

''نہیں سمجھنا؟''

''سمجھ لیا۔''

''کیا؟''

''جو آپ نے سمجھایا۔''

''لیکن ابھی تو تم کہہ رہی تھیں سمجھ نہیں آیا۔''

''ہاں' ٹھیک کہا' نہیں آیا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سجیل کو اس نے بوکھلا دیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔؟''

''کچھ نہیں۔''

''ہنس کیوں رہی ہو؟''

''نہ ہنسوں۔''

''ضرور ہنسو' لیکن۔۔۔۔۔۔''

''لیکن کیا۔۔۔۔۔۔؟''

''نیرا۔۔۔۔۔۔ کیا ہو رہا ہے تمہیں۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں سوال سمجھا رہا تھا۔''

وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کہانا سمجھ گئی' جو سمجھایا وہ بھی اور جو نہیں سمجھایا وہ بھی۔''

بجیل اس کی نظروں اور لفظوں کا مفہوم پا کر خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولا۔ ''سچ نیرا۔۔۔۔۔۔؟''

''ہاں بجیل!'' نیرا نے سرخ ہوتے ہوئے چہرہ جھکالیا۔

بجیل کا جی چاہا' سرخ ہوتی شرماتی لجاتی نیرا کو سینے میں چھپالے' اس طرح کہ اس کے سوا اور کوئی اسے دیکھ نہ سکے' محسوس نہ کر سکے' وہ ہو اور اس کی نیرا۔۔۔۔۔۔دوسرا کوئی نہ ہو' کوئی نہ ہو۔''

''نیرا۔۔۔۔۔۔'' اس نے بے اختیارانہ کہا۔

لیکن نیرا جواب دیئے بغیر اٹھ گئی۔ شاید اسے بجیل سے شرم آنے لگی تھی۔ بجیل پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کرسی میں اپنا وجود ڈھیلا چھوڑ کر نیم دراز ہو گیا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ کتنے حسین رنگ اس کی بند آنکھوں میں بکھر گئے تھے۔

نیرا اور بجیل چھپ چھپ کر کبھی نہیں ملے تھے۔ تنہائیاں بھی میسر آجاتی تھیں اور رونقوں میں بھی قربتیں مل جاتیں۔ اس کی ڈھکی چھپی چاہت سے شاید سبھی آگاہ بھی تھے۔ تبھی تو دونوں کے والدین نے ان کا بندھن باندھنے کی نیت کی ہوئی تھی لیکن بجیل نے امریکہ جانے کا پروگرام بنا ڈالا تو سبھی نے اس بندھن کے اعلان کو واپسی تک ملتوی کر دیا۔

''خدا جانے وہاں جا کر بجیل کے خیالات کیسے ہو جائیں؟''

''کوئی گوری چکر میں نہ پھنسالے۔''

''میچور ہو کر خیالات بدل بھی سکتے ہیں۔''

''یہی بہتر ہے کہ اس کی واپسی پر ہی یہ بندھن باندھا جائے۔''

''انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔''

''کچھ بھروسہ نہیں' خاص کر اس معاشرے میں بس کر کم ہی لوگ اپنوں کی طرف واپس آتے ہیں۔''

''شادی کر کے جاتے ہیں اور وہاں بدل جاتے ہیں۔''

''بجیل ایسا تو نہیں' پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہے۔ خیریت سے واپس آجائے گا تو بات بھی کر لیں گے۔''

بجیل اور نیرا کے والدین دونوں ہی کی ایک جیسی سوچ تھی۔ بات ٹھیک بھی تھی۔ تجربے اور مشاہدے میں یہ باتیں آچکی تھیں۔

اس لیے دونوں کی چاہتوں اور پیار کا علم ہونے کے باوجود بھی نسبت کا اعلان نہیں کیا۔ اعلان کیا دونوں سے اس سلسلے میں کسی نے بات نہیں کی۔

بات کرنے سے شاید فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ بجیل کی محبت تو ایک اٹل سچائی تھی جسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو جامع ہوتی ہے' ٹھوس ہوتی ہے' اپنا وجود رکھتی ہے۔ ٹوٹتی نہیں' بکھرتی نہیں' ہمیشگی کی ضامن ہوتی ہے۔

جس طرح پانی ہمیشہ ڈھلان کی طرف بہتا ہے۔

جس طرح سورج ہمیشہ مشرق ہی کی طرف سے نکلتا ہے۔

جس طرح چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ہوتی ہیں۔

جس طرح زمین کا گولا اپنے مدار میں ہی گھومتا ہوا سرکتا ہے۔

یہ سب ازل سے ابد کی طرف بغیر کسی تبدیلی' بغیر کسی رکاوٹ' بغیر کسی ٹھہراؤ کے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک اٹل اور نہ بدلنے والی سچائی کی طرح۔

بجیل کی محبت ایسی ہی تھی۔ بزرگوں کی سوچ و فکر اپنی جگہ' لیکن اس کے جذبوں میں تبدیلی' رکاوٹ یا ٹھہراؤ کا امکان ہی نہیں تھا۔

وہ امریکہ چلا آیا تھا۔ ایک اعتماد اور مستحکم عزم لے کر۔ اس سے جب نیرا کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور اس نے ایئر پورٹ جانے کی بھی اپنے میں ہمت نہ پائی تھی تو بجیل نے اس کی آنکھوں کی ساری نمی اپنی مسکراہٹ میں اتارتے ہوئے کہا۔ ''خود ہی تو امی سے اجازت دلائی ہے اب یوں دل چھوٹا کیا تو میں وہاں کیسے رہ سکوں گا۔ مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کرو نیرا۔۔۔۔۔۔۔ یہ مسکراہٹ میری امانت ہوگی۔ جب میں واپس آؤں گا یہ مسکراہٹ تمہارے لبوں پر پھیل کر میرا استقبال کرے گی۔''

نیرا بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے ہولے سے بولی۔ ''وہاں جا کر بھول تو نہ جاؤ گے۔''

''اپنے آپ کو بھول جاؤں تو یہ بات ممکن ہے۔ لیکن تمہیں نہ بھلا پاؤں گا نیرا۔۔۔۔۔۔۔؟ تمہاری یاد ہی تو میری ساتھی ہوگی۔ اسی کے سہارے تو دن گزریں گے۔''

''بجیل۔۔۔۔۔۔۔'' نیرا کی آواز آنسوؤں سے رندھی تھی۔

بجیل کا دل دکھ رہا تھا۔ لیکن وہ نیرا کی تسلی کے لیے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا تھا۔ اسے پیار بھرے دلاسے دے رہا تھا۔

یہ ساری باتیں وہ پورے خلوص اور تہہ دل سے کہہ رہا تھا۔ وہ ان باتوں پر قائم تھا۔ اور تین برس ان باتوں پر وہ پوری صداقت

اور ایمانداری سے قائم رہا تھا۔

اب وہ واپس جا رہا تھا۔

امیدوں اور ارمانوں کی سہانی دنیا دل میں بسائے خوبصورت خوابوں کی حسین تعبیروں کا تصور لیے۔ نیرا سے دور رہ کر وہ اس کے اور قریب ہو گیا تھا۔ دوریاں بعض اوقات قربتوں کی امین بھی تو بن جاتی ہیں۔

اب وہ واپس جا رہا تھا۔

اور

نیرا کے لیے بہت عمدہ بہت بڑھیا اور بہت خوبصورت تحفے لینے کے لیے سرگرداں تھا۔

اس کے دوست نے انگوٹھی کی رائے دی تھی۔ خود اس نے بھی اس بارے میں سوچا تھا' لیکن

''میری بات مان لو یار' خوبصورت سی انگوٹھی لے لو۔ جب تم ایک دوسرے کو چاہتے ہو تو پھر سوچ بچار کیوں۔ جاتے ہی انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دینا۔ میرا تو خیال ہے گھر والے اس سے خوش ہو جائیں گے۔ تمہاری واپسی پر یہ بندھن والدین نے باندھنا ہی ہوگا۔''

''خیال تو یہی ہے۔''

نعیم نے بجیل کو غور سے دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''جب یقین سے کہتے ہو کہ نیرا بھی تمہیں چاہتی ہے تو پھر تمہارے رویے اور سوچ میں بے یقینی کیوں؟''

''بے یقینی نہیں۔''

''تو_____؟''

''مجھے یہاں آئے تین سال ہو چکے ہیں۔''

''تو کیا تین سال میں نیرا بدل گئی ہوگی؟''

''ہرگز نہیں۔''

''پھر_____؟''

''گھریلو حالات کا ٹھیک سے کچھ علم نہیں۔ والدین کی رائے کا بھی مجھے صحیح پتہ نہیں۔ رشتے ناتے جوڑنا بزرگوں ہی کا کام ہے اور

ہمارے خاندان میں تا حال کسی نے بزرگوں کے فیصلے سے بغاوت کرنے کی جرات نہیں کی۔"

"تو تمہیں یہ وہم بھی ہے کہ بزرگ یہ فیصلہ تمہارے حق میں نہیں کریں گے۔"

"کیا پتہ۔۔۔۔۔۔۔خاندان میں نیرا کے ہم عمر بہت سے لڑکے اور بھی ہیں اور میری ہم عمر لڑکیاں بھی۔"

"میری مانو انگوٹھی ساتھ لے جاؤ۔ یہی تحفہ موزوں ہے۔ چپکے سے پہنا دینا۔۔۔۔۔۔۔بس کام ختم!"

سجیل نے اس کی بات بال آخر مان ہی لی اور نیرا کے لیے خوبصورت ڈائمنڈ والی نفیس' نازک اور بڑی قیمتی انگوٹھی خرید ہی لی۔

"نیرا۔۔۔۔۔۔۔نیرا۔۔۔۔۔۔۔" عرفان دوڑا آیا۔

"کیا ہے؟" نیرا نے بھائی کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بالوں میں برش کر رہی تھی۔

"ایک خوشخبری۔۔۔۔۔۔۔"

"پاس ہو گئے ہو؟"

"نہیں۔۔۔۔۔۔۔ابھی رزلٹ کہاں آیا ہے۔"

"تو پھر اس طرح بھاگے۔۔۔۔۔۔۔" اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے عرفان سے پوچھا۔

"بھئی' بات ہی ایسی ہے۔"

"کیسی ہے؟"

"خوشی کی۔"

"بتا بھی چکو اب"

"سجیل بھائی بدھ کی شام کو یہاں پہنچ رہے ہیں۔"

"سجیل۔۔۔۔۔۔۔" نیرا کا رنگ ایک دم ہی کچھ بے رنگ سا ہو گیا۔

"ہاں نیرا' سجیل بھائی۔۔۔۔۔۔۔تار آیا ہے۔ ساڑھے سات کی فلائیٹ سے پہنچ رہے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔۔۔۔۔" اس نے اتنی مری مری آواز میں کہا کہ عرفان گھوم کر اس کے سامنے آتے ہوئے بولا۔

"کیوں خوشی نہیں ہوئی اس خبر سے۔۔۔۔۔۔۔؟"

''ہوئی یا نہیں' تمہیں اس سے کیا۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''ہر وقت لڑنے کے موڈ ہی میں ہوتی ہو' لیکن آج مابدولت تم سے لڑائی مول نہیں لیں گے۔ کیونکہ ہم بہت خوش ہیں آج' بجیل بھائی کے آنے کی خبر سن کر۔ خوب مزہ آئے گا' دیکھنا کتنی رونق ہوگی ان کے آجانے سے۔''

عرفان خوشی میں جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا' نیرا اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ جواب کیا دیتی وہ تو شاید اس کی باتیں سن بھی نہیں رہی تھی۔

وہ تو

وہ تو

جانے کن خیالوں میں کھو گئی تھی۔

عرفان چلا گیا۔ تب بھی وہ وہیں سٹول پر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی رہی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا برش خود کار انداز میں اس کے بالوں میں چلتا رہا۔

اور

وہ

تین سال کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلی مسافتوں میں گم ہوتی چلی گئی۔

اس گمشدگی میں ڈر' خوف' ندامت' پچھتاوا سبھی کچھ تھا۔

اس کے کانوں میں بجیل کے جاتے سمے کہے جملے' جاتے وقت کا سینہ چیرتے کہاں سے آ ٹپکے تھے۔ ''مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کرو نیرا' یہ مسکراہٹ میری امانت ہوگی' جب میں واپس آؤں گا تو یہ مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر پھیل کر میرا استقبال کرے گی۔''

غیر شعوری طور پر اس نے اپنا ہاتھ ہونٹوں پر پھیرا' پھر آئینے میں ان ہونٹوں کو دیکھا۔ اس امانت کا پرتو تو اسے اپنے ہونٹوں پر نظر نہیں آیا۔

گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحے یونہی بیٹھی رہی۔

پھر برش میز پر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے اپنا سراپا آئینے میں دیکھا۔غور سے اپنی آنکھوں میں جھانکا اور پھر گھبرا کر آئینے سے ہٹ کر بیڈ پر آ گری۔ تکیے میں منہ دے لیا۔۔۔۔۔۔۔اور سوچوں میں گم ہو گئی۔

سجیل۔۔۔۔۔۔۔

سجیل آ رہا تھا۔

سجیل جو تین سال پہلے اسے جدائی کا روگ دے کر امریکہ چلا گیا تھا۔

وہ کئی ماہ اداس رہی تھی۔سجیل کی کمی محسوس کرتی رہی تھی۔اس کا دل کسی بات میں نہیں لگتا تھا۔ویرانی ہی ویرانی چاروں طرف پھیلی نظر آتی تھی۔

لیکن

یہ

ویرانی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی تھی۔اس میں چپکے چپکے بہاروں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔غیر محسوس طریقے سے ۔۔۔۔۔۔۔بالکل ہی غیر محسوس طریق سے۔

ہوا یوں تھا کہ چھوٹی پھپھو سلمٰی کے بیٹے عمیر کو ایک فارن کمپنی میں ملازمت ملی تھی۔اور یہ کمپنی اس شہر میں تھی۔وہ اپنے ننھیال میں رہنے آیا تھا۔دونوں ماموں شفیق اور مہربان تھے۔اس لیے اسے ان کے ہاں رہنے میں کوئی جھجک یا عار نہیں تھی۔سجیل کے جانے کے بعد کمرہ بھی خالی تھا۔اس لیے بڑے ماموں نے اسے اپنے ہاں ہی ٹھہرایا تھا۔لیکن اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔گھر تو ایک ہی تھا' جہاں جی چاہتا رہ سکتا تھا۔

عمیر نے تعلیم ختم ہوتے ہی نوکری کے لیے درخواستیں دے دی تھیں۔یہ ملازمت اسے جلدی مل گئی تھی۔بہت ہی معقول تنخواہ کے ساتھ دوسری سہولتیں بھی تھیں۔

عمیر خوبرو نوجوان تھا۔بہت شگفتہ مزاج تھا۔تکلف کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔سب سے دوستی پہلے ہی تھی۔اب تو ایک جگہ رہنے سے وہ ان سب سے یوں گھل مل گیا تھا' جیسے ان کے ساتھ ہی رہتا چلا آ رہا ہو۔زندگی کا دھیما پن اور ٹھہراؤ اسے بالکل پسند نہیں تھا۔بلچل اور تیزی سے مانوس تھا۔

اس لیے جب وہ پہلے پہلے نیرا سے ملا تو اس کی بسورتی اداس صورت سے اسے چڑسی ہونے لگی۔ اس کے اکھڑے پن سے کوفت ہوئی۔

نیرا اسے بھی شروع ہی سے اچھی لگتی تھی۔ ایک بار تو اس نے اپنی امی سے کہہ بھی دیا تھا۔

''امی! آپ کے میکے میں ایک ہیرا ہے' وہ دیکھ لینا میں کسی نہ کسی دن اڑا لاؤں گا۔''

امی نے بڑے فخر سے اترا کر کہا تھا۔ ''میرے میکے کے ہیرے انمول ہیں بیٹے' اڑانے کے لیے نہیں پانے کے لیے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ اور پانے کے لیے انتھک محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جب محنت اور جدوجہد سے اس قابل ہو جاؤ گے تو پھر اڑانے کی سوچ نہیں آئے گی ذہن میں' اسے پانے کے حقدار ہو جاؤ گے۔''

اب وہ اس ہیرے کو پانے کا حقدار تھا۔ اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد ایک بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔ اس نے آتے ہی نیرا سے دوستی کرنا چاہی' لیکن نیرا اداس اداس بجھی بجھی رہتی تھی۔ اس کا بڑھا ہاتھ تھامنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

لیکن

عمیر بھی دھن اور لگن کا پکا تھا۔ نیرا کے اردگرد پھیلی ویرانی اور اداسی کو سمیٹ کر اسے مسرور و شاداں کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

وہ بہت ہولے ہولے آہستہ آہستہ اس کے قریب آتا چلا گیا۔ اس نے نیرا کو چونکایا نہیں' حیران بھی نہیں کیا' پریشان بھی نہیں کیا' بس دھیرے دھیرے جیسے دن چڑھے تو روشنی پھیلتی جاتی ہے' شام اترے تو اندھیرا گہرا ہوتا چلا جاتا ہے' جیسے ابتدائی تاریخوں کا چاند ہولے ہولے بڑا ہوتا جاتا ہے' جیسے وقت کی اکائیاں مل مل کر دن مہینے اور سال بنتے چلے جاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ اسی طرح عمیر نے اپنی محبت اور پیار کو بڑی نرمی' بڑی احتیاط اور بڑے حوصلے سے برتا۔ نیرا اپنی وحشت زدہ ویرانی سے نکلتی چلی آئی۔ اور جب وہ پریشانی' اداسی اور ویرانی کے حصار سے باہر آ گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں عمیر کی محبت انگڑائیاں لے رہی ہے۔ وہ پیار کے ہوشربا طلسم میں گرفتار ہو چکی ہے۔ ان لمحوں میں اسے بجیل کا خیال بھی ضرور آیا۔

لیکن

نشہ اور اس کا سرور اس کے حواس پر چھایا تھا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو محبت نام کی کوئی چیز بجیل سے وابستہ نہ پائی۔ ہاں' ایک احترام کا احساس ضرور موجود تھا۔

عمیر اور نیرا ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے۔ پیار کے حقیقی جذبوں سے تو وہ شاید آب آشنا ہو چکی تھی۔

''عمیر! تم پہلے کہاں تھے' اتنی دیر سے کیوں آئے؟ میرے دل کے در پر سب سے پہلی دستک تم نے کیوں نہ دی؟'' ایک دن اس نے عمیر کے کندھے پر سر رکھ کر یہ کہہ ہی دیا۔ بجیل کے متعلق وہ عمیر کو بہت کچھ بتا چکی تھی۔

''دیر سے آیا ہوں۔'' عمیر بولا۔ ''لیکن آ تو گیا ہوں۔ اب جانے والا نہیں۔ پہلی دستک کسی نے بھی دی ہو' مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ دستک دے کر لوٹ جانے والے کے لیے پریشان نہیں ہوا کرتے نیرا۔۔۔۔۔۔۔ دستک دے کر در کھلنے کے انتظار میں کھڑے رہنے والے کو دیکھا کرتے ہیں ہیں۔ میں پورا ایک سال اس انتظار میں پورے استحکام سے کھڑا رہا' تب کہیں جا کر تمہیں پایا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں' تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن کبھی کبھی ڈر لگنے لگتا ہے۔''

''کس بات کا؟''

''پہلی دستک دینے والا ابھی انتظار میں کھڑا ہوا تو۔۔۔۔۔۔۔؟''

''تمہارا اشارہ بجیل کی طرف ہے۔''

''ہاں''

''ایک بات بتاؤ نیرا۔۔۔۔۔۔''

''ہوں''

''تم محبتوں کے درجات اور تقدس کی تمیز کر سکتی ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''تم پورے یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تمہارے دل میں کس کے لیے محبتیں مچل رہی ہیں۔''

''وہ تمہارے سوا کوئی نہیں۔''

''تو پھر۔۔۔۔۔۔۔ ڈرتی کس سے ہو؟''

''بجیل کے ان جذبوں سے جن کو نا سمجھی میں میں نے قبول کر لیا تھا۔ لیکن اب سمجھتی ہوں کہ وہ میرے بچپنے کی باتیں تھیں۔ الہڑ سی لڑکی کی جذباتی ہلچل تھی۔''

''تم نے اس کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا؟''

''شاید کبھی نہیں۔''

''اس نے۔''

''اس نے بھی نہیں۔''

''تو پھر۔۔۔۔۔۔۔''

''میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔''

عمیر چپ ہو گیا۔ نیرا نے گھبرا کر اسے دیکھا اور بولی۔ ''برا تو نہیں مان گئے۔ دیکھو عمیر' میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپائی' اس لیے نہیں چھپائی کہ میں صرف اور صرف تمہیں۔۔۔۔۔۔۔''

وہ چپ ہو گئی' عمیر نے اس کی کمر کے گرد بازو لے جاتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔ دونوں خاموش تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے جذبات اور الجھاؤ کو دونوں ہی سمجھ رہے تھے۔

ایسے موقعے کئی بار آئے۔

عمیر ہمیشہ ہی نیرا کو مطمئن کر دیتا۔ نیرا اس کی چاہتوں کی نرمی اور گرمی سے تسکین بھی پا لیتی۔ اس کی بے پناہ محبت کا احساس جانفزا بھی لگتا۔ لیکن کبھی کبھی عمیر الجھن میں مبتلا کر دیتا۔ ایسے لگتا اس نے بجیل کی حق تلفی کی ہے۔ اس کی سمندروں کی طرح گہری محبت کو ٹھکرایا ہے۔ اس کی خاموش چاہتوں کو پامال کیا ہے۔

لیکن ضمیر کی اس ملامت کے باوجود وہ جانتی تھی کہ عمیر اس کی زندگی کا محور بن چکا ہے۔ وہ اور عمیر یک جان دو قالب ہیں۔ ایک دوسرے سے الگ ہونے کا تصور بھی محال تھا۔

یہ بات عمیر بھی جانتا تھا۔ وہ دونوں چاہتوں کے اس راستے پر چل رہے تھے۔ جس پر آگے ہی آگے بڑھتے ہیں لوٹتے نہیں۔ یہ راستے قدموں کے بڑھتے نشانوں سے بنتے ہیں۔ جوں جوں آگے بڑھتے جائیں' پچھلی راہوں کے نشان گم ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے تو واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ نشان راہ ہی نہیں ملتا۔ لوٹا کس طرح جائے۔

''اب ہم وہاں پہنچ چکے ہیں نیرا جہاں سے لوٹنا ممکن ہی نہیں۔'' ایک گہری خوبصورت شام جب دونوں لان میں پھولوں اور سبزے کی مہک گندھی فضا میں سانس لے رہے تھے' عمیر نے نیرا کے کانوں میں مدھری سرگوشی کی۔

''ہاں عمیر۔۔۔۔۔۔۔'' نیرا نے حسین ادا سے اسے دیکھا۔

''تو پھر۔۔۔۔۔۔۔کیوں نہ ہم ایک مضبوط بندھن میں بندھ جائیں۔شادی کے متعلق کیا خیال ہے؟''عمیر نے قدرے شوخی سے اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھتے ہوئے اس کا چہرہ اونچا کیا۔

''ہٹو''وہ ادائے ناز سے شرمائی۔

''نیرا۔۔۔۔۔۔''

''ہوں''

''میں چاہتا ہوں امی کو ماموں کے پاس بھیجوں۔''

''کس لیے؟''

''تمہیں مانگنے کے لیے۔''

وہ مسکرا کر چپ ہوگئی۔

''پیشتر اس کے کہ کوئی دوسرا حقدار پیدا ہوجائے'تمہیں اپنا بنالینا چاہتا ہوں۔''

وہ مسکرا کر بولی۔''دوسرا حق دار۔۔۔۔۔۔۔؟''

''ہاں''

''مجھے تسلی دیتے ہو اور خود خوفزدہ رہتے ہو۔کیا تم سمجھتے ہو کہ کوئی تمہیں مجھ سے یا مجھے تم سے چھین سکتا ہے۔''

''نہیں'یہ بات نہیں۔۔۔۔۔۔۔چھیننے یا چھن جانے کا سوال ہی نہیں۔لیکن اپنے خاندان کے بزرگوں کو تم بھی جانتی ہو'میں بھی۔۔۔۔۔۔۔اس دور میں بھی وہ اپنے فیصلے دوسروں پر چسپاں کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔پیشتر اس کے وہ اپنا حق استعمال کریں' کیوں نہ ہم۔۔۔۔۔۔''

وہ ادائے دلفریبی سے مسکرانے لگی۔

عمیر بولا۔''اب کے گھر میں گیا تو امی سے بات کروں گا'وہ آکر ماموں سے بات کرلیں۔''

نیرا نے اسے دیکھا' بہت گہری اور خوبصورت نگاہوں سے دیکھا۔پھر ہولے سے بولی۔''تمہیں شاید سجیل کی طرف سے۔۔۔۔۔۔''

عمیر نے جلدی سے کہا۔''سجیل کی طرف سے مجھے کوئی خدشہ تو نہیں'لیکن وہ اس خاندان کا بڑا لڑکا ہے۔یہ نہ ہو اس کی بڑائی کو حق

بنا دیا جائے اور وہ۔۔۔۔۔۔۔"

"نہیں عمیر، نہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، فکر نہ کرو۔"

"ہونے تو میں بھی نہیں دوں گا، لیکن کسی بدمزگی سے پہلے ہی احتیاطی تدابیر کر لی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

"نہیں"

"پھر ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک"

دونوں نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ مضبوطی، گہرے گہرے اور گھمبیر جذبوں کے استحکام کی علامت تھی۔

عمیر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کے گھر گیا تو واپسی پر امی کو رشتہ مانگنے کے لیے ساتھ ہی لے کر آئے گا۔

لیکن اس کے جانے سے پہلے ہی جمیل کے واپس آنے کی اطلاع آ گئی تھی۔

جمیل آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ بدھ کی شام ساڑھے سات کی فلائیٹ سے۔

یہ خبر عرفان نے نیرا کو دی تھی۔

اس خبر نے نیرا کو خوش ہونے کی بجائے متوحش کر دیا تھا۔ عمیر گھر پہ نہیں تھا، اس لیے وہ بیڈ پر آن گری تھی اور سوچوں کے جال میں الجھ گئی تھی۔ ضمیر نے ایک بار پھر سر ابھارا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا، خوفزدہ سی ہو رہی تھی۔ عمیر آ جاتا تو وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر اس ڈر اور خوف سے نجات پا لیتی۔

لیکن

اس کا گھر پہ نہ ہونا بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا۔ نیرا نے عمیر کے سہارے بنا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ کئی سوچوں پر سنجیدگی سے سوچنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جمیل کے آتے ہی وہ اسے عمیر کے متعلق بتا دے گی۔ اسے کہہ دے گی کہ وہ عمیر سے محبت کرتی ہے۔ اس کے بغیر رہ نہیں سکتی، جی نہیں سکتی۔

شام کو عمیر گھر آیا تو اس کو بھی جمیل کے آنے کی خبر ملی۔ اس خبر نے ایک لمحہ کے لیے تو اسے بھی بوکھلا دیا۔ وہ اسی گھبراہٹ اور پریشانی سمیت نیرا کے پاس آیا۔

نیرا تب تک پر سکون ہو چکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مسکرائی۔ ''اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ بجیل کے آنے کی اطلاع مل گئی تمہیں۔''

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔میں تو ابھی گھر جا بھی نہیں پایا اور۔۔۔۔۔۔۔''

''اور وہ آ گیا۔۔۔۔۔۔۔ہوں۔۔۔۔۔۔۔فکر کی کوئی بات نہیں عمیر۔۔۔۔۔۔۔میں نے ایک بات سوچ لی ہے۔''

''کیا؟''

''ہم بجیل کو آتے ہی اپنے متعلق سب کچھ بتا دیں گے۔'' عمیر نے نیرا کی طرف دیکھا' وہ اطمینان اور سکون سے بولی۔ ''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔۔۔۔۔۔۔سمجھے!''

وہ سوچوں میں گم رہا۔ شاید اسے یقین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ نیرا جو کچھ اتنی جرات سے کہہ رہی ہے' وہ اسے اس بہادری سے عملی جامہ بھی پہنا سکے گی؟ فیصلہ کر لینے اور اسے عملاً پورا کرنے میں جتنی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں' وہ جانتا تھا۔

بجیل بستر میں نڈھال سا پڑا تھا۔ اضمحلالی کیفیت سے دوچار تھا۔ کبھی کروٹ بدل لیتا' کبھی چت لیٹ جاتا۔ ذہن میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ نیرا کے رویے سے بہت پژمردہ ہو رہا تھا۔

کتنی امنگوں اور ارمانوں کو من میں بسائے وہ جہاز سے اترا تھا۔ اس کی نظریں نیرا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن ائیر پورٹ پر گھر کے سب لوگ آئے تھے' صرف نیرا نہیں تھی۔ سب لوگوں نے اس کا والہانہ خوشی سے استقبال کیا تھا۔ وہ پیار کرنے والوں کے ہجوم میں گھر گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک ہی ان سے بچھڑ کر اکیلا رہ گیا ہے۔ اس نے گھبرا کر مرینہ سے پوچھا تھا۔ ''نیرا نہیں آئی؟''

مرینہ نے نیرا ہی کی زبان میں جواب دیا تھا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

گھر آ کر بھی نیرا اس کو نظر نہیں آئی تھی۔ رات کے کھانے پر اس نے نیرا کو میز کے آخری سرے پر عمیر کے قریب بیٹھے دیکھا تھا۔ وہیں سے اس نے اس کے سلام کا جواب دیا اور رسمی سی احوال پرسی کی تھی۔

اور جب کھانے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تھے' بجیل نے نیرا کو خود ہی بلایا تھا۔

''آؤ نا یہاں بیٹھو' کہاں جا رہی ہو؟''

''اپنے کمرے میں۔'' اس نے سرد مہری سے جواب دیا تھا۔

''طبیعت خراب ہے' میرا مطلب ہے زیادہ ہی خراب ہے؟''

''نہیں''

''تو پھر۔۔۔۔۔۔۔؟''

''بس یوں ہی''

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جمیل بھی ڈرائنگ روم میں کچھ زیادہ دیر نہ بیٹھ پایا تھا۔ سفر کی تھکان بھی تھی اور ذہنی اضمحلال بھی۔ وہ اپنے کمرے میں اٹھ آیا تھا۔ نیرا کا سرد اور بے مہر رویہ اس کے ذہن پر تازیانے برسا رہا تھا۔ اس کی ساری خوشیاں اور سارے خواب بکھر رہے تھے۔

ایسا کیوں؟

ایسا کیوں ہوا؟

وہ سوچے جا رہا تھا۔

جب اس کی سوچیں تھک گئیں تو اس کا جی بے اختیارانہ چاہا کہ نیرا کے پاس جائے' اس سے پوچھے' اسے جھنجھوڑے' اسے ہلا ڈالے کہ آخر کیوں اس نے اس کے سینچ سینچ کر رکھے جذبوں کی سرد مہری کے وزنی پتھر تلے کچل ڈالا۔ وہ تو اس کے لبوں کی آخری مسکان کو امانت چھوڑ کر گیا تھا' اس نے تین سال جہان رنگ و بو میں رہ کر بھی اسی کا دم بھرا تھا۔ جب وہ گیا تھا تو نیرا نے خاموشیوں ہی میں اسے اپنی محبتوں کا احساس دلایا تھا۔ وہ محبتیں کہاں گئیں' کیوں دم توڑ گئیں' کیوں زندہ نہ رہ پائیں؟

وہ بیڈ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر بالکنی میں آ گیا۔ برابر والے حصے میں ہی تو نیرا کا کمرہ تھا۔ اس نے چاہا بھاگ کر جائے اور دھم سے نیرا کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس جائے۔ اس کے قدم اٹھے ہی تھے

لیکن

آگے نہ بڑھ سکے۔

وہ جہاں تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

نیرا' عمیر کے ساتھ لان سے برآمدے کی طرف آ رہی تھی۔

اس نے ان کی باتیں نہیں سنیں۔ نہ ہی ان کے چہرے کے تاثرات ملگجے اندھیرے میں ٹھیک سے دیکھ پایا۔ لیکن جس طرح وہ ساتھ ساتھ چلتے آرہے تھے۔ سجیل کو نیرا کے بے مہر سرد رویے کا جواب مل گیا۔

تو

تو

یہ بات ہے۔

سجیل نے بے قراری سے دونوں ہاتھوں پر سر گرالیا۔

پھر اسے پتہ نہ چلا کہ رات کیسے گزری۔

سکھ دکھ وقت کی زنجیر میں پروئے ہوتے ہیں۔ یہ لمحوں کی زیست پر منقسم ہوتے ہیں۔ وقت گزرتا ہے' لمحے بیتتے ہیں' تو دکھ سکھ کی گہرائی اور گیرائی میں بھی فرق پڑتا ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان خوشیوں کا بار سنبھال نہ پائے اور دکھوں کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو جائے۔

سجیل کے چند دن بعد دکھوں کی صلیب پر لٹکتے گزرے۔ ہر گزرنے والے لمحے نے اسے احساس دلایا کہ وہ جو امیدیں اور خواب لے کر آیا تھا' وہ سراب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ عمیر اور نیرا جس مقام پر پہنچ چکے تھے وہ جان لینا مشکل نہیں تھا۔ پیار کی پھوار پڑ رہی تھی اور ان کے وجود اس پھوار سے گیلے ہو رہے تھے۔ چاہتوں کے سوتے ان کے انگ انگ سے پھوٹتے تھے اور ان سوتوں کی ٹھنڈک محسوس کی جا سکتی تھی۔

سجیل کو دونوں کی سرشاری کا بہت جلد احساس ہو گیا۔

لیکن

اس کے باوجود اس نے یہ محسوس کیا کہ نیرا کچھ گھبرائی گھبرائی سہمی سہمی رہتی ہے۔ شاید اس کا ضمیر اسے خلش میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ وہ جب امریکہ گیا تھا تو نیرا اتنی چھوٹی بھی نہ تھی کہ ان چاہتوں اور محبتوں کو پہچاننے کی حرکات قرار دے سکے۔ ان دنوں وہ کلی ضرور تھی لیکن ایسی کلی جو پھول بننے کے مراحل سے گزرنے والی تھی۔ بلکہ گزر رہی تھی۔ اب وہ شگفتہ پھول تھی۔ کلی سے پھول بننے کے درمیان کے سفر میں اس نے ٹھہراؤ کا مقام تبدیل کر لیا تھا۔ سجیل کی جگہ عمیر کو منتخب کر لیا تھا۔ شاید یہ تبدیلی نیرا کی گھبراہٹ کا باعث تھی۔

سجیل نے کئی دن بڑی خاموشی لیکن گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ بات واقعی یہی تھی۔ نیرا اس سے کھل کر بات نہ کرتی تھی' سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ وہ کوئی بات پوچھتا تو گھبراہٹ میں الٹا سیدھا جواب دے کر ادھر ادھر ہو جاتی تھی۔

سجیل کو دکھ ہوتا۔

وہ یہ جان کر بھی کہ نیرا اب اس سے نہیں عمیر سے پیار کرتی ہے اسے چاہے جا رہا تھا بلکہ اس کی چاہت میں اور شدت آ گئی تھی۔

اس نے کئی بار چاہا کہ نیرا سے کہے۔ ''نیرا ہنسو مسکراؤ' خوش رہو' ذہن سے سارے بوجھ جھٹک دو' خدا نے تمہیں صرف اور صرف پھول کی طرح کھلنے کے لیے بنایا ہے' کھلو اور مہک سے فضا کو معطر کر دو۔''

لیکن وہ یہ باتیں نیرا سے کہہ نہیں سکا۔ نیرا کے پاس ان باتوں کے سننے کا وقت ہی کب تھا۔

خود فریبی انسانی فطرت کا اک جزو ہے۔ انسان مایوسی کے اندھیرے میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ جانتے ہوئے بھی انجان بن کر اپنے آپ کو تسکین دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس سے اسے گوہر مقصود تو ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن خود فریبی کی لذت غم کی اذیت کو کچھ کم ضرور کر دیتی ہے۔ سجیل بھی ان دنوں اس منزل سے گزر رہا تھا۔

''شاید میں نے غلط سمجھا ہو۔''

''شاید تین سالوں کے طویل عرصے نے جھجک پیدا کر دی ہو۔''

''شاید نیرا کتراتی نہیں شرماتی ہو۔''

وہ خود فریبی میں مبتلا تھا۔ حالانکہ جاننے کے لیے تو ایک حساس لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اور یہ لمحہ اس پر سے ایک بار نہیں کئی بار گزر چکا تھا۔ پھر بھی اسی دن اس نے فیصلہ کیا کہ ایک بار نیرا سے پوچھ ہی لے۔

وہ اس خیال سے نیرا کے کمرے کی طرف آیا۔ دروازہ کھلا تھا اور نیرا کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتا بیرونی چمن کی طرف آ گیا۔ شام کے دھندلکے میں پیڑوں کے سائے تلے اسے آنچل لہراتا نظر آیا۔ وہ تیز قدموں سے ادھر بڑھا۔ لیکن اس کے قدم موٹے تنے والے درخت کے ادھر ہی رک گئے۔ نیرا ایک جھولتی شاخ پکڑے کھڑی تھی اور عمیر درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دونوں کسی اہم موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ کسی کی باتیں چھپ کر سننا اخلاقی گراوٹ تو ہے لیکن بعض اوقات دل کے معاملے ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ان گراوٹوں کو حق سمجھ کر استعمال کرتا ہے اور اپنے آپ کو ضمیر کی گرفت میں آنے نہیں دیتا۔ سجیل بھی انسان تھا۔ دکھوں کی کھیتی دل میں سینچے اذیتیں جھیل رہا تھا۔ کیسے نہ سنتا ان کی باتیں۔۔۔۔۔۔۔

نیرا کہہ رہی تھی۔ ''پھپھو جلدی آ جاتیں تو اچھا ہی تھا۔ تم نے غلطی کی' اسی دن ہی چلے جانا تھا۔''

عمیر کا جواب تھا۔ ''فون آیا ہے' وہ آ رہی ہیں۔ سجیل سے ملنے آنا ہی تھا انہیں' آئیں گی تو بات ہو جائے گی۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے عمیر' گھر میں رشتوں کی کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ تائی اماں مجھے بہت پیار کرتی ہیں' اگر انہوں نے۔۔۔۔۔۔''

''کچھ نہ کہو نیرا' امی آج کل میں آ رہی ہیں' تب تک۔۔۔۔۔۔''

''تب تک کوئی فیصلہ ہو گیا تو کیا کرو گے' اپنے بڑوں کو جانتے ہو نا۔۔۔۔۔۔''

''کر لوں گا۔ اول تو امی کے آتے ہی بات بن جائے گی۔ وہ ماموں سے تمہیں مانگ لیں گے اور اگر ان کے آنے سے پہلے ہی کوئی فیصلہ کر لیا گیا تو میں اس فیصلے کو پنپنے نہیں دوں گا۔''

''احتجاج کرو گے؟''

''برملا کہوں گا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اس لیے تمہیں میرے سوا کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔''

''اکیلے میں تو سب ہی بلند بانگ دعوے کر لیتے ہیں' بزرگوں کی عدالت میں منہ کھولنا آسان بات نہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ لیکن میں سب کچھ کر گزروں گا۔ تمہاری طرح کم ہمت اور کم حوصلہ نہیں۔''

''میں۔۔۔۔۔۔''

''تو اور کون؟''

''کیسے؟''

''کہتی تھی نا بجیل کو آتے ہی بتا دوں کہ میں عمیر سے پیار کرتی ہوں۔۔۔۔۔۔ کہہ سکیں کچھ؟''

''اسی لیے ڈر رہی ہوں' میں اس سے واقعی کچھ نہیں کہہ سکی۔ کہوں بھی کیسے عمیر۔۔۔۔۔۔ میں اس سے شرمندہ ہوں' سامنا نہیں کر پاتی۔ بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ضمیر پر بوجھ سا ہے۔''

''اوہ'' عمیر کا لہجہ ایک دم ہی بدل گیا۔

''دیکھو عمیر۔۔۔۔۔۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اس سے الٹ مطلب نہیں لینا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اور پھر میں نے تم سے کچھ چھپایا بھی نہیں تھا۔ بجیل کا میں بہت احترام کرتی ہوں' لیکن تم میرے لیے۔۔۔۔۔۔''

وہ روہانسی ہو گئی۔

عمیر اس اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''میں سب کچھ جانتا ہوں نیرا' تم پچھتاوا محسوس نہیں کرتیں۔ اخلاقی طور پر ندامت تمہارے حصے میں آتی ہے۔ لیکن اپنا ذہن پوری طرح ایک طرف کر لو۔ یہ ندامت جو ہے نا اس کا بار جھٹک ڈالو۔ میں نہیں چاہتا کہ

میرے اور تمہارے درمیان کسی اور کا گزر ہو۔ یہ گزر خواہ ندامت ہی کا کیوں نہ ہو۔ یہ ندامت بھی تو سجیل کے حوالے ہی سے ہے نا۔''

''عمیر! بڑے حاسد ہو۔''

''میرے پیار کو کسی بوجھ کا متحمل ہونا نہیں آتا۔۔۔۔۔۔۔ سمجھیں!''

''تو پھر میں کیسے ضمیر کے اس بوجھ سے چھٹکارا پاؤں' تم ہی کچھ بتاؤ۔''

سجیل چپ رہا۔

پھر

اس نے کچھ بتایا نہیں۔ سجیل نہ جان سکا۔ وہ تو ہولے ہولے بے آواز قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

اور پھر بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے نیرا کے ذہن سے بوجھ ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

جو اس نے سوچا وہ نہ تو نیرا سوچ سکتی تھی نہ ہی عمیر۔

محبتوں کے عروج میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے۔ جب اس سے غرض نکل جاتی ہے۔ اپنا آپ ختم ہو جاتا ہے۔ آس رہتی ہے نہ امید' اپنی ہستی نظر آتی ہے نہ وجود۔ صرف اور صرف محبوب کی ذات رہ جاتی ہے۔ اور محب اس ذات کی ہر خوشی' ہر فائدے اور ہر امید کے لیے قربان ہو جاتا ہے۔

دوسری ہی صبح نیرا جب اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ شاید کسی کام سے امی کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ سجیل سامنے آ گیا۔

نیرا۔۔۔۔۔۔'' اس نے آہستگی سے پکارا۔

''جی'' نیرا کچھ گھبرا گئی۔

''ایک کام ہے تم سے۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں''

''کہیے''

''تمہارے کمرے میں چلتے ہیں یا میرے کمرے میں آ جاؤ۔ کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں تم سے۔''

نیرا کا دل بیٹھ گیا۔ رنگت پھیکی پڑ گئی اور ہونٹ خشک سے ہونے لگے۔ سہم کر بولی۔ ''میں تائی امی کے پاس جا رہی تھی۔''

''کوئی بات نہیں چلی جانا۔ میری بات تو سن لو۔ چند منٹ لوں گا۔ چلو تمہارے کمرے ہی میں چلتے ہیں۔''

نیرا نے اس کی طرف دیکھا۔

جمیل نے ہولے سے مسکرا کر سر ہلایا۔

نیرا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ اس نے بیڈ کے تکیے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

جمیل کھلی کھڑکی کی طرف آ گیا اور چند لمحے پشت پر ہاتھ باندھے باہر دیکھتا رہا۔

نیرا کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ جمیل کیا کہنے والا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن یوں لگتا تھا محاسبے کا لمحہ آن پہنچا ہے۔

جمیل ایک دم ہی مڑا اور نیرا کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ ''نیرا۔۔۔۔۔۔۔''

نیرا چپ رہی۔

وہ ایک قدم اور اٹھا کر آگے آ گیا۔ نیرا نے تکیہ چوبی مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''نیرا'' وہ پھر بولا۔ ''جو بات کہوں گا اس سے شاید تمہیں دکھ ہو' کیونکہ۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ جب میں امریکہ گیا تھا تو تمہیں۔۔۔۔۔۔۔''

نیرا آنکھیں پھیلائے اسے تکے جا رہی تھی۔ دل دھڑکنا بھول رہا تھا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

''ہاں جب میں امریکہ گیا تھا تو بہت سی امیدیں اور چاہتیں تمہاری جھولی میں ڈال کر گیا تھا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ان پر کاربند نہ رہ سکا۔ میں نے وہاں ایک مصری لڑکی سے جو تعلیم حاصل کرنے وہاں آئی ہوئی ہے۔''

نیرا چوبی تکیہ چھوڑ کر جلدی سے اس کے سامنے آتے ہوئے بولی۔ ''آپ اس لڑکی سے۔۔۔۔۔۔۔''

''پیار کرتا ہوں اور اس شادی کا وعدہ بھی کر چکا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

نیرا بیڈ کے کنارے پر ٹک کر ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی۔

''میں نادم ہو نیرا' شاید تم میری آس میں آج تک بیٹھی ہو گی۔ میں معذرت خواہ ہوں' مجھے معاف کر دینا۔ میں اس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اس سے شادی کرنے کا وعدہ بھی کر چکا ہوں۔''

''سچ۔۔۔۔۔۔۔ سچی۔۔۔۔۔۔۔'' نیرا کے لبوں سے یہی نکلا۔ لگتا تھا خوشی کی یلغار کے سامنے وہ سنبھل نہیں پا رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دو گی نا' میں واقعی تم سے سخت نادم ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔''

''جی۔۔۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔۔''

''اور ہاں۔۔۔۔۔۔میں اس لڑکی سے شادی کرلوں' تو امی کو رام کرنے میں میرا ساتھ ضرور دینا۔امی تمہیں بہت چاہتی ہیں' تمہاری بات مان لیتی ہیں۔۔۔۔۔۔ہیں نا۔۔۔۔۔۔یاد ہے مجھے امریکہ بھجوانے میں بھی تم نے امی۔۔۔۔۔۔''

''ہاں' ہاں۔۔۔۔۔۔''نیرا کے چہرے پر طمانیت کی روشنی پھیل گئی۔

''مجھے معاف کردوگی نا۔۔۔۔۔۔''بجیل نے آہستگی سے پوچھا۔

''بالکل' بالکل۔۔۔۔۔۔کردیا معاف۔۔۔۔۔۔''وہ اچھلتی کودتی موج کی طرح چھنکتے ہوئے بولی۔

بیڈ سے اٹھی اور بولی۔''بس یہی کہنا تھا۔۔۔۔۔۔؟''

''ہاں''بجیل نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''میں جاؤں اب۔۔۔۔۔۔؟''اس نے کہا تو بجیل کو یوں لگا جیسے وہ کمرے سے نہیں اس کی زندگی سے جانے کے لیے کہہ رہی ہے۔

''جاؤ''اس نے بھی یوں کہا' جیسے اپنی زندگی سے نکل جانے کا پروانہ دے دیا ہو۔

وہ کمرے سے تیز اور شریر ہوا کے جھونکے کی طرح نکل بھاگی۔شاید یہ خوشخبری وہ عمیر کو سنانا چاہتی تھی۔

بجیل وہیں کھڑا تھا۔

خاموش

اور چپ چاپ

نیرا خوش ہوگئی تھی۔اس کے ضمیر کا بوجھ اتر گیا تھا۔بجیل کے لیے یہی کافی تھا۔وہ نیرا کو خوش دیکھ کر ہی خوش رہ سکتا تھا۔خوشی صرف ہنسنے مسکرانے ہی کا نام تو نہیں' غم اور دکھ بھی بعض اوقات خوشی دیتے ہیں۔پھر بعض اوقات انسان ہار جاتا ہے۔

لیکن

یہ ہار۔۔۔۔۔۔ہار نہیں ہوتی' جیت ہوتی ہے۔

اخلاق کی

پیار کی

اور

انسانیت کی

جمیل نے ہار مان کر یہ جیت پائی تھی۔

◆◆◆

رقابت

راجو حواس باختہ سا دوڑا۔

وہ لکڑی کاٹنے ان گھنے درختوں کے جھنڈ میں گیا تھا جو ندی کنارے ڈھلانوں پر بڑی افراط میں پائے جاتے تھے۔ ابھی وہ اپنی کلہاڑی سیدھی بھی نہ کر پایا تھا کہ اس نے چند گز کے فاصلے پر کلہاڑی چمکتی دیکھی۔

کلہاڑی اٹھی ہوا میں لہرائی اور چمکی۔

اور

دوسرے لمحے ایک نسوانی ادھوری چیخ فضا میں گونجی۔

ساتھ ہی کسی کے بھاگتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

راجو نے درختوں کی شاخیں ہٹا کر ادھر دیکھا۔ ایک لمحہ تو جیسے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ نوجوان چودھری فضل کے ہاتھ میں خون آلود کلہاڑی پکڑی تھی۔ اس کا ایک پاؤں ٹوٹے درخت کے اس تنے پر تھا جس پر چند لمحے پہلے بلو بیٹھی تھی اور اب اس کے دو ٹکڑے خون میں لپ پت پڑے تھے۔ بھاگنے والا قادرا تھا۔

راجو کا سکتہ ٹوٹا تو وہ کلہاڑی وہیں چھوڑ گاؤں کی طرف بھاگا۔

سرپٹ

حواس باختہ

پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا' پھڑ پھڑاتے ہونٹوں سے ادھورے الفاظ کہتا۔

گاؤں کے باہر ہی اسے گاماں ملا اس کے ساتھ فیروزاں تھی۔ دونوں کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ راجو کو اس حال میں دیکھا تو گامے نے راجو کا کندھا پکڑ کر پوچھا۔ ''کہاں بھاگے جا رہے ہو' کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔ اتنے حواس باختہ کیوں ہو؟''

راجو کے منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی۔ ''وہ۔۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔۔ چو۔۔۔۔۔۔۔ چو۔۔۔۔۔۔۔''

فیروزاں ہنس پڑی۔ ''ڈر گیا ہے۔ سویرے سویرے لکڑیاں کاٹنے جنگل میں جاتا ہے نا۔''

''اے راجو۔۔۔۔۔۔۔کچھ کہہ تو سہی' یہ چو۔۔۔۔۔۔۔چو۔۔۔۔۔۔۔کیا لگا رکھی ہے۔''

راجو نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے بے قابو دل کو تھام کر کہا۔''چودھری فضل۔۔۔۔۔۔۔چودھری۔۔۔۔۔۔۔''

''کیا ہوا چودھری فضل کو۔۔۔۔۔۔۔؟'' راجو نے جدھر انگلی سے اشارہ کیا تھا فیروزاں اور گاماں دونوں ادھر دیکھنے لگے۔

کچھ لمحے اسی طرح گزر گئے۔ دو چار آدمی اور بھی ادھر آ گئے۔ دودھ کا گڑوہ اٹھائے حیدرا بھی لوگوں کو دیکھ کر رک گیا اور گھوڑی کی باگ تھامے نصیر بھی ادھر آ گیا۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔

راجو قدرے سنبھلا تو اس نے چشم دید واقعہ لوگوں کو سنا دیا۔

لوگ حیران رہ گئے

ششدر رہ گئے

گنگ سے رہ گئے

چند لمحے تو کوئی کچھ کہہ ہی نہ سکا

پھر فیروزاں بولی۔''ہائے میں مر گئی' چودھری فضل نے بلو کو مار ڈالا۔''

''ہاں' کلہاڑی سے دو ٹکڑے کر دیئے اس کے سر۔۔۔۔۔۔۔'' راجو گھگیایا۔''اور وہ قادرا بھاگ گیا۔''

''قادرا۔۔۔۔۔۔۔'' کسی نے کہا۔

''ہاں'' راجو لمبے لمبے سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

''ہوں'' لمبی سی ہوں کئی لوگوں کے منہ سے نکلی۔

بہت سے لوگ جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔

کوئی بولا۔''بلو اور قادرے کے متعلق میری گھر والی بھی کچھ کہہ رہی تھی۔''

''غیرت مند بھائی نے یہی کرنا تھا۔''

''چودھری فضل بڑا غیور ہے۔''

''بہن کے لچھن۔۔۔۔۔۔۔''

''لیکن اس کی سگی بہن تو نہیں تھی۔''

''سگی۔۔۔۔۔۔سگی اور کیا ہوتی ہے؟ شروع ہی سے فضل اسے بہن سمجھتا ہے۔ وہ اسے بھائی جانتی ہے۔ کتنا پیار تھا دونوں میں۔''

''ہاں یہ بات ہے۔ دونوں کا پیار تو مشہور ہے۔ سب جانتے ہیں بلو کو تو فضل جان سے پیارا تھا۔''

''فضل کو بھی وہ کچھ کم عزیز نہ تھی۔ ہم نے تو سگے بہن بھائیوں میں بھی اتنا پیار نہیں دیکھا جتنا ان دونوں میں تھا۔''

''لگتا ہے بلو قادر سے چھپ چھپ کر ملتی تھی۔''

''میں نے تو سنا تھا بلو کی ماں نے قادرے سے اس کی منگنی کر دی تھی۔''

''ابھی کی کہاں تھی' ارادہ تھا۔''

''فضل کو قادر اپسند نہ تھا۔ ظاہر ہے وہ شادی سے پہلے بہن کو اس کے ساتھ ملنے سے روکتا تو کتا ہوگا۔''

''ہاں' یہ بات تو ہوگی' جبھی تو۔۔۔۔۔۔۔ہائے ہائے سچ مچ ہی قتل کر دیا بلو کو۔۔۔۔۔۔۔چل کر دیکھو تو سہی۔''

''سب چلو' جلدی کرو۔۔۔۔۔۔۔اے کوئی ان کے گھر بھی اطلاع دے یہ صبح سویرے کیا اندھیر ہو گیا ہائے ہائے۔''

سب مرد عورتیں آگے پیچھے جائے واردات کی طرف بھاگے۔ جو سن رہا تھا وہ بھی ادھر دوڑ رہا تھا۔

سب کا خیال تھا چودھری فضل موقعہ واردات سے اب تک بھاگ گیا ہوگا اور بلو کی لاش بھی شاید اس نے ندی میں پھینک دی ہو۔

لیکن

ایسا نہیں تھا۔

چودھری فضل وہیں کھڑا تھا۔ خون آلود کلہاڑی ہاتھ میں تھی اور بلو کی لاش درخت کے تنے سے جس پر وہ بیٹھی تھی' لڑھک کر نیچے آن گری تھی۔ خون ہی خون بکھرا تھا۔

لوگ دنگ رہ گئے۔

گنگ ہو گئے۔

''فضل یہ کیا کیا تو نے۔۔۔۔۔۔۔'' کئی لمحوں کے بعد گاؤں کے باریش بزرگ نے آگے بڑھ کر فضل کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''غیرتاں والا ویر۔۔۔۔۔۔۔'' ایک عورت بلو کی لاش پر نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔

''سگے بھائی سے بھی زیادہ غیرت والا۔۔۔۔۔۔۔'' کوئی اور بولا۔

''بدچلنی کوئی غیرتاں والا برداشت نہیں کرسکتا۔'' دوسرا بولا۔''اس بے غیرت قادرے کو پکڑو بھاگ گیا ہے۔''

''یہ بات ٹھیک ہے لیکن یہ انتہائی اقدام۔۔۔۔۔۔۔'' دوسرا بزرگ افسوس کرتے ہوئے بولا۔

''جوش غیرت میں کچھ سوجھتا تھوڑا ہی ہے۔'' گاماں ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''قادرا بھاگ گیا۔'' کسی نے کہا۔

''بھاگ کے جائے گا کہاں'' کئی نوجوانوں نے سینے پر ہاتھ مارے۔

''بلو کی جگہ فضل اس کے ٹوٹے کرتا بلو بیچاری تو معصوم سی تھی۔اسی نے ورغلایا ہوگا۔'' فیروزاں بولی۔

''ورغلایا کیا۔۔۔۔۔۔۔میں نے تو سنا تھا ان کی شادی ہونے والی ہے۔قادرا بلو کی ماں کا دور پار کا رشتہ دار ہے۔آتا جاتا تھا گھر میں۔'' زینے نے جلدی سے کہا۔

''وہ تو صحیح ہے کئی دفعہ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے گھر میں جاتے آتے دیکھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں حیلے بہانے لڑکی کو ایسی سنسان جگہ پر لاکر۔۔۔۔۔۔۔''

''کیا پتہ۔۔۔۔۔۔۔کچھ تو کیا ہوگا جو چودھری فضل کی غیرت برداشت نہ کرسکی۔''

لاش اور چودھری کے اردگرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔سب چودھری کی غیرت کو سراہتے ہوئے بلو کی موت پر اظہار افسوس کر رہے تھے۔قادرے کو گالیاں دے رہے تھے۔

فضل اس گاؤں کا بڑا جیالا نوجوان تھا۔قد کاٹھ کا مضبوط اور شکل وصورت کا اچھا تھا۔گھڑسواری میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔آس پاس کے کسی گاؤں میں بھی اس کے پلے کا گھڑسوار نہیں تھا۔وہ کوئی بہت بڑا زمیندار نہیں تھا۔تھوڑی سی زمین تھی جس پر وہ بڑی محنت کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ لوگ کہتے تھے چودھری فضل کی زمین فصل نہیں دیتی سونا اگلتی ہے۔اس کی حویلی بھی اپنی زمینوں کے قریب ہی تھی۔کسی زمانے میں اس گاؤں کا بیشتر حصہ اسی کے دادا پڑدادا کی ملکیت تھا۔لیکن زمین بٹتے بٹتے اس کے حصے میں اتنی ہی آئی تھی۔ یہ بھی ان کی زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے کافی تھی۔

وہ ابھی پانچ چھ سال ہی کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔اس کا باپ اپنی بیل گاڑی پر اناج منڈی لے کر گیا تھا۔شہر میں ٹرک کے ساتھ ٹکر ہوگئی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔زمین کی دیکھ بھال اور گھر بار کا سارا بوجھ اس کی ماں کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ماں

نے کمال صبر اور ہمت سے کام لیا تھا۔ فضل کو باپ کی محبت بھی دی اور ماں کا پیار بھی۔ وہ اسے خوب پڑھانا لکھانا چاہتی تھی لیکن فضل ماں سے الگ ہو کر شہر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے پرائمری تک تعلیم حاصل کی اور ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ بہت بہادر' جی دار اور جیالا شروع ہی سے تھا۔

اس کی عمر ابھی تیرہ چودہ برس ہی کی تھی کہ وہ زمینوں کی دیکھ بھال خود کرنے لگا تھا۔ بوائی کٹائی اور فصل کی فروخت وہ خود ہی کرتا تھا۔

''ماں اب تو آرام کر۔ تیرا بیٹا اس قابل ہو گیا ہے کہ سارے کام خود سنبھال سکے۔''

ماں دعائیں دیتے نہ تھکتی۔ اتنا ہونہار اور فرمانبردار بیٹا تھا۔ بیوگی کے جیسے سارے دکھ دور ہو گئے۔ بلو اس کی ماں کی تایا زاد بہن نوراں کی بیٹی تھی۔ بلوری آنکھوں' گوری رنگت اور بادامی سنہری مائل بالوں والی بلو ان کے ہاں شروع ہی سے آتی جاتی تھی۔ وہ چھوٹا تھا تو ماں سے پوچھا کرتا۔ ''یہ بلی کون ہے؟''

''تیری بہن ہے فضلے۔۔۔۔۔۔۔ تیری ماسی نوراں کی بیٹی ہے۔''

''میری بہن ہے؟''

''ہاں''

''تو پھر ہمارے پاس ہی کیوں نہیں رہتی۔۔۔۔۔۔۔ آ کر چلی کیوں جاتی ہے؟''

''اس کا اپنا گھر دوسرے گاؤں میں ہے نا۔''

''پھر میری بہن تو نہ ہوئی۔''

''بہن ہی ہے۔''

''اپنی بہن؟''

''ہاں''

''پھر میں اسے جانے نہیں دوں گا۔''

وہ جب بھی آتی فضل بہت خوش ہوتا۔ چھوٹی سی بلو اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ جب بھی ماسی نوراں جانے لگتی وہ اسے زبردستی پکڑ لیتا۔ ''ماسی یہ میری بہن ہے۔ میں اسے جانے نہیں دوں گا۔''

ماسی نوراں ہنس پڑتی۔ ''پھر آ جائے گی بیٹا''

''لیکن یہ میری بہن ہے۔''

''ہاں ہاں' تیری بہن ہے۔۔۔۔۔۔۔میں کب کہتی ہوں' نہیں ہے۔''

وہ ضد میں آ جاتا اور کبھی کبھی تو نوراں کو مجبوراً بلو کو ان کے ہاں ہی چھوڑ کر جانا پڑتا۔

فضل کی ماں کہتی۔'' آج رہنے دے اسے یہاں ہی' میں کل چھوڑ آؤں گی۔ اسی بہانے تیرے گھر بھی ہو آؤں گی۔''

بلو انہی کے ہاں رہ جاتی تو فضل کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ ہوتا۔ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اپنے ہمجولیوں کے پاس لے جاتا اور فخر سے سینہ تان کر کہتا۔'' دیکھو میری بہن۔۔۔۔۔۔۔بلو میری بہن ہے۔۔۔۔۔۔۔اتنی اچھی ہے۔''

وہ ماں سے بھی کہتا۔'' ماں! بلو کو اپنے پاس ہی رکھ لو نا' وہ میری بہن ہے۔۔۔۔۔۔۔اسے میرے پاس ہی رہنا چاہیے نا۔''

ماں اسے پیار کرتی اور کہتی۔'' تیری بہن ہی ہے بلو۔۔۔۔۔۔۔لیکن وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔ اس کے ماں باپ دوسرے گاؤں میں رہتے ہیں۔''

''میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔مجھے میری بہن ادھر چاہیے' ادھر''

وہ اپنے گھر کی زمین پر انگلی سے اشارہ کر کے کہتا تو ماں مسکرا دیتی۔ وہ جانتی تھی فضل ایک اکیلا ہے کوئی بھائی ہے نہ بہن ۔۔۔۔۔۔۔یہ محرومی اسے بلو سے زیادہ سے وابستہ کر رہی تھی۔ لیکن وہ مجبور تھی' بلو کو اپنے ہاں کیسے اٹھا لاتی۔ اس کے ماں باپ کیسے دے دیتے اسے۔ ان کی کون سی اور اولادیں تھیں۔ تین بچے پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔ یہ بلو واحد اولاد تھی جو بچی تھی۔

لیکن

جذبوں کی کشش بھی کچھ معنی رکھتی تھی شاید۔۔۔۔۔۔۔بلو کا ابا چند دن بیمار رہ کر مر گیا۔ نوراں بے سہارا ہو گئی۔ کوئی جائیداد تھی نہ زمین۔ دیور محنت مزدوری کرتے تھے جو اپنا ہی پیٹ پالتے تھے۔ جوان بیوہ عورت کا وہاں رہنا تھا۔ دیوروں کی نگاہیں ابھی سے بدل گئی تھیں۔ وہ اپنے دکھڑے فضل کی ماں ہی کو سناتی تھی۔ وہی سب سے قریبی عزیزہ تھی۔

''نوراں'' ایک دن فضل کی ماں نے کہا۔

''ہاں''

''تو میرے پاس ہی آ جا۔۔۔۔۔۔۔میں بھی تو اکیلی ہوں تو بھی اکیلی ہے۔ ویسے بھی فضل بلو کے لیے ضد کرتا رہتا ہے۔ میں

سمجھوں گی خدا نے مجھے ایک بیٹا نہیں دیا' بیٹی بھی دی ہے۔''

نوراں کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ یہاں چلی آئے۔

فضل کی ماں خاندان کے دو تین معتبر عورتوں اور مردوں کو نوراں کے ہاں لے کر گئی۔ اس کے دیوروں سے پوچھا۔ دونوں دیوروں نے اجازت دے دی۔

فضل کی ماں نوراں کو ساتھ لے آئی۔

کئی کمروں والی حویلی کے مشرقی حصے کا بڑا دالان اس نے نوراں کو دے دیا۔

بلو کے آجانے سے فضل بہت خوش تھا۔

''بلو اب میری بہن بن گئی ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہتا۔

''ہاں تمہاری بہن تمہارے پاس آ ہی گئی۔'' نوراں گہری سانس بھر کر کہتی۔

''تو بالکل فکر نہ کر نوراں'' فضل کی ماں اسے تسلی دیتی۔ ''بلو اب تیری نہیں میری بیٹی ہے۔ میرے فضل کی بہن کوئی نہ تھی نا' اللہ نے دے دی۔ زندگی رہی تو تو دیکھے گی میں اسے بیٹی بنا کر رکھوں گی اور بیٹی بنا کر ہی بیاہوں گی۔''

''تیرا بھلا ہو بہن'' نوراں آنچل سے آنکھوں کے گوشے پونچھ کر کہتی۔ ''تم نہ ہوتیں تو جانے میرا کیا حشر ہوتا۔''

''اللہ کارساز ہے نوراں ۔۔۔۔۔۔۔ اس کی رضا پر بندے کو راضی رہنا چاہیے۔ میرے سر سے بھی تو فضل کے ابا کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ وقت گزر ہی رہا ہے۔ تیرا بھی گزر جائے گا۔ حوصلے اور صبر سے بیٹھی رہ۔''

نوراں کے آنے سے فضل کی ماں کو بھی بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ گھر کا کام کاج تو اس نے اپنے ہی ذمہ لے لیا تھا صرف صبح اٹھ کر دہی وہ بلوتی تھی' یا کبھی ہانڈی پکا لیتی۔ یوں بھی ایک سے دو بھلا ہی ہوتا ہے۔ دکھ سکھ کی باتیں کر لیتی تھیں دونوں' دل کے غبار دھل جاتے تھے' بوجھ ہلکے ہو جاتے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ ماہ و سال کا چکر چلتا رہا۔ بلو اور فضل ایک ہی چھت تلے بھائی بہن بن کر پلتے رہے۔ دونوں میں پیار بہت تھا لیکن لڑائی جھگڑا بھی بہت ہوتا۔

فضل جب بھی بلو کو کوئی کام کہتا وہ دوڑ دوڑ کر کرتی۔ لیکن کبھی کبھی وہ اڑ جاتی تو فضل اس کے بالوں میں مٹھی بھر کر اسے اتنے جھٹکے دیتا کہ وہ چیخ اٹھتی۔

''اللہ کرے مرجائے تو'' وہ بددعاؤں کے ساتھ گالیاں بھی بکتی۔

فضل کو اور غصہ آتا۔ ''مجھے گالی دیتی ہے۔''

وہ بال بمشکل چھڑا کر کہتی۔ ''دفع ہو نہیں ہوں میں تیری بہن''

''اچھا یہ تڑی دیتی ہے' دیکھتا ہوں کیسے نہیں ہے میری بہن۔۔۔۔۔۔۔اب کہہ ذرا۔۔۔۔۔۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر کہتا۔

تو وہ ہنس کر اس سے لپٹ جاتی۔ ''لالہ! میں تیری بہن ہوں' بس مجھے مارا نہ کر۔''

وہ خوش ہو جاتا' اسے پیار کر لیتا۔ ''بلی اپنے پنجے تو بھی نہ مارا کر۔''

''لالہ جب تو مجھے غصے کرتا ہے نا تو مجھے بھی غصہ آجاتا ہے۔'' وہ مسکرا کر کہتی۔

''آخر میری بہن ہے نا۔'' وہ بھی ہنس دیتا۔

سارے گاؤں والے ان کے پیار کو دیکھتے اور متاثر ہوتے تھے۔ ایک دفعہ فضل گھوڑی سے گر گیا۔ ٹخنے میں چوٹ آگئی۔ وہ تو رویا نہیں' ہاں بلو نے رو رو کر آنکھیں سجالیں۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ فضل کی پٹی سے دن رات لگی بیٹھی رہی۔ کئی بار اس نے فضل کے زخمی ٹخنے کو چوما۔ ''ہائے میرا ویر۔۔۔۔۔۔۔کتنی تکلیف ہوتی ہے تجھے۔ ہائے میں گر جاتی' تم نہ گرتے۔''

فضل اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''جھلی۔۔۔۔۔۔۔تو گرتی تو کیا مجھے تکلیف نہ ہوتی۔ تیرا تو خدا کبھی بال بیکا نہ کرے۔ تجھے کچھ ہوا تو مر جاؤں گا میں۔''

بلو اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''مریں تیرے دشمن میرے لالہ''

گاؤں کے لوگ احوال پرسی کو آتے تو دیکھتے بارہ تیرہ سالہ بلو فضل پر کس کس طرح نچھاور ہو رہی ہے اور فضل اس پیار پر کتنا اتراتا ہے۔

فضل کئی ماہ گھوڑی کی سواری نہ کر سکا۔ اسے اس بات کا بڑا دکھ تھا۔

''لالہ۔۔۔۔۔۔۔دکھی کیوں ہوتے ہو؟ تھوڑے دنوں تک تم گھوڑی پر سواری کر سکو گے۔ یہ تکلیف سدا ہی تھوڑی رہے گی۔''

''سواری تو اب بھی کر سکتا ہوں مجھے تو فکر اس میلے کی ہے جس میں میں نے مقابلہ میں شریک ہونا ہے۔''

''تب تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے پیر بابا کے مزار پر جا کر منت مانی ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو اصلی گھی کے چراغ جلاؤں گی اور لالہ میں نے تمہارا مقابلہ جیتنے کی بھی بہت ساری منتیں مانی ہیں۔''

''او میری پیاری بہن' تیری باتوں سے مجھے بڑا سہارا ملتا ہے۔ تو کہتی ہے تو میں واقعی جلدی ٹھیک ہو جاؤں گا اور مقابلہ بھی جیتوں گا۔''

جس دن فضل مقابلے کے لیے جا رہا تھا۔ بلو نے اس کے بازو پر امام ضامن کا سوا روپیہ باندھا۔ اس کی پگڑی کو بوسہ دیا اور اس کی گھوڑی کی گردن سہلاتے ہوئے بولی۔ ''سن ری۔۔۔۔۔۔۔ میرے لالہ نے اول آنا ہے۔ مقابلہ نہ جتایا تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ میرے ویر کو سرخرو کر کے لانا۔''

اس کے گھبرو جوان فضل پر پیسے وار وار کر نچھو میراثن کو بھی دیئے۔ فضل نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بلو نے یہ ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا۔

ارد گرد کھڑے لوگ بہن بھائی کی محبت کو عقیدت اور احترام کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مقابلہ فضل نے جیتا انیس سال کی عمر میں' یہ اس کا پہلا مقابلہ تھا اس نے آتے ہی بلو کو پیار کیا۔ ''تیری دعاؤں اور منتوں سے جیتا ہوں۔''

بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ بلو تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی۔ گھر گھر لڈو دینے گئی۔ سہیلیوں کے ساتھ مل کر گدا ڈالا۔ بھائی پر صدقے واری ہو ہو گئی۔

''تجھے کہیں نظر نہ لگ جائے بلو' میری بہن۔۔۔۔۔۔۔ خوشیاں سمیٹ کر رکھ۔'' اسے اتنا خوش دیکھ کر بولا۔

''خوشیاں مناتے مناتے میں مر بھی جاؤں نا تو کوئی افسوس نہیں لالہ'' وہ جھوم گئی۔

''مرنے کا نام لیتی ہے تو کلیجہ ہلا دیتی ہے۔ مت ایسی باتیں منہ سے نکالا کر۔'' فضل نے اس کا منہ بند کر دیا۔

فضل نے اگلے سال بھی مقابلہ جیتا۔

اور

پھر

اس سے اگلے سال بھی

بلو خوشیاں منا منا کر پاگل ہو جاتی۔ فضل خوش ہو ہو کر کہتا۔ ''جھلی ہے بالکل جھلی' میری بہن'' فضل اپنی فصل شہر لے کر خود ہی جاتا تھا۔ کھرے دام ملتے' محنت ٹھکانے لگتی۔ واپسی پر وہ بلو کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی چیز لے کر آتا۔

انہیں دنوں بلو کے لیے رشتے آ رہے تھے۔ اب وہ سولہ سترہ سالہ حسین و جوان دوشیزہ تھی۔ اس کا ہاتھ لوگ مانگ رہے تھے۔ نوراں کی بیٹی کر کے تو شاید کوئی سوالی ہوتا یا نہ ہوتا' ہاں فضل کی بہن کے رشتے کی مانگ تھی۔ ان رشتوں میں قادرے کا بھی رشتہ تھا۔ اس کی ماں بھی دو پھیرے ڈال چکی تھی۔ قادرا بلو کے باپ کا رشتہ دار بھی تھا۔ کڑیل جوان تھا اور زمینداری بھی خاصی تھی۔ آٹھ نو جماعتیں پڑھا بھی تھا۔ بلو کو اس نے کسی شادی میں دیکھا تھا تب ہی ماں سے اس رشتے کے لیے کہہ دیا تھا۔

بلو کا جو بھی رشتہ مانگنے آتا فضل کی امی سے بات کرتا۔

نوراں خوش ہوتی کہتی۔ ''بھلے دھی بنائی ہے' اب بھگتو جو کچھ کرو گی تم ہی کرو گی۔''

''ضرور کروں گی' بلو کو میں نے سمجھ کر گود لیا ہوا ہے۔ دیکھنا اس کا بھائی کتنی شان سے اسے وداع کرتا ہے۔''

''بلو کی قسمت۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ میرے پاس تو چار جوڑے بھی کام کے نہیں تھے۔''

''فکر نہ کر' چودھری فضل دین کی بہن شان سے بیاہی جائے گی۔''

فضل کی ماں اس سے بھی کبھی بلو کی شادی کا ذکر چھڑتی تو یہی کہتی۔ ''پترا۔۔۔۔۔۔۔ بہن کا بیاہ تو نے کرنا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور اس طرح کرنا ہے کہ کوئی یہ نہ کہے بلو فضل کی اپنی بہن نہ تھی۔ سارے ارمان پورے کرنے ہیں اس کے۔''

''اچھا ماں'' وہ کہتا۔ ''جب بیاہ کروں گا دنیا دیکھے گی۔ لیکن ابھی سے تو فکر مند نہ کر مجھے' اسے وداع کرنے کے خیال ہی سے دل ہول کھانے لگتا ہے۔''

''بہنیں اور بیٹیاں اپنے گھروں ہی کو سدھارتی ہیں پترا۔۔۔۔۔۔۔ انہیں گھر میں رکھا جا سکتا تو کوئی ایک بال بھی ان کا دوسروں کو نہ دیتا۔ لیکن دنیا کا یہی دستور ہے۔ پالو پوسو اور دوسروں کے حوالے کر دو۔''

''ہوں''

''بلو اب جوان ہو گئی ہے۔ رشتے آ رہے ہیں۔ قادرا نوراں کو بھی پسند ہے۔ ہر طرح سے موزوں ہے بلو کے لیے۔۔۔۔۔۔۔''

''اچھا ماں دیکھا جائے گا۔''

قادرا فضل کی نظر میں بھی تھا۔ وہ دو ایک دفعہ حویلی ماں کے ساتھ آیا بھی تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔

ماں دوسرے چوتھے دن بلو کی شادی کی بات ضرور چھیڑ دیتی۔

اس دن فضل شہر جا رہا تھا۔ ماں نے بلو کے لیے کچھ چیزیں منگوانے کے لیے اسے پیسے دیئے۔

''اب جہیز بنانا ہے۔ اچھی سی' بڑھیا چیزیں لانا۔''

''اچھا'' فضل نے کہا اور ماں کی بتائی ہوئی چیزیں ذہن میں رکھ لیں۔

وہ ماں کی مطلوبہ چیزیں بازار سے خرید رہا تھا کہ ایک دکان پر چاندی کے گھونگھریوں والے بالے نظر آئے اس نے بلو کے لیے خرید لیے۔

وہ خوش خوش گھر آیا۔ ماں کی چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور بالوں والا لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر بلو کو دکھایا۔

''یہ کیا ہے لالہ؟'' وہ اس کی طرف لپکی۔

''تیرے لیے لایا ہوں۔''

''کیا؟''

''بوجھ بھلا''

''چوڑیاں''

''اوں ہوں''

''گجرے''

''نہیں''

''بندے''

''آں۔۔۔۔۔۔۔ بندے بھی نہیں ہیں۔''

''تو کیا ہے' دکھاؤ نا'' اس نے اچک کر فضل کے ہاتھ سے لفافہ اڑا لیا اور کچھ دور جا کر لفافہ کھول کر دیکھا بڑے بڑے بالے دیکھ کر تو جیسے خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ بھاگی آئی اور فضل کے کندھے سے جھول کر بولی۔ ''تم نے کیسے جان لیا لالہ۔۔۔۔۔۔۔ کہ ان بالوں کی مجھے بڑی خواہش تھی۔''

''اچھا''

''ہاں''

''چل پھر جلدی سے پہن کر دکھا' دیکھوں اس بندری پر کیسے سجتے ہیں۔''

''اوں ہوں۔۔۔۔۔۔۔پھر بندری کہا۔۔۔۔۔۔''

''اچھا بلی۔۔۔۔۔۔۔مانو بلی''

وہ ہنس پڑا۔

''پہلے میں خود دیکھوں گی پہن کر' اچھے لگے تو تمہیں دکھاؤں گی۔''

''جو نہ لگے۔''

''تو پھر اپنے ہونے والی بھابی کے لیے سنبھال کر رکھ دوں گی۔''

''چل چل بڑی آئی بھابی کے لیے رکھنے والی' پہن کے دکھا۔''

فضل صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بلو اچھلتی کودتی سامنے والے دالان میں غائب ہوگئی اور جب باہر نکلی تو فضل اسے ایک ٹک تکتا رہ گیا۔

''کیسی لگتی ہوں لالہ'' وہ بالوں کو ہلکورے دیتی اس کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔

کالے کرتے پر چھاپے والی لالی پیلی چنری اوڑھے بلو اس کے سامنے کھڑی سر کو ہلکی ہلکی جنبش دے کر بالے ہلا رہی تھی۔

اور

پتہ نہیں وقت سے بکھرا ہوا کون سا حساس لمحہ تھا جو فضل کی روح کے اندر اتر کر اسے دہلا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے بلو کو وہ آج پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

بھرے بھرے بدن' سنہری رنگت' بلوری آنکھوں اور بادامی سنہری مائل بالوں والی نوجوان لڑکی اس کے اپنے ہی خوابوں کا پرتو تھی۔ اس کے ذہن میں اگ آئی تھی' بالکل خودرو بیل کی طرح۔

وہ اس خوش لدی بیل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وہ معصومیت سے بولی۔ ''اچھے لگے ہیں نا؟''

''بہت اچھے۔۔۔۔۔۔۔بہت ہی اچھے۔'' فضل نے ایک ٹک اسے تکتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھنے کی بجائے اس کے سر پر آہستگی سے پھیرا۔

''میں اپنی سہیلیوں کو دکھا آؤں۔'' وہ خوشی سے باؤلی ہو رہی تھی۔

''نہیں''

''کیوں؟''

''ابھی ٹھہرو، یہیں۔۔۔۔۔۔۔اسی طرح کھڑی رہو۔''

''کیوں نظر لگانی ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف بھاگ گئی۔

فضل بت بنا کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے اندر دھماکے ہونے لگے۔ اس کے ذہن میں تلاطم بپا ہو گیا۔ اس کے من نے سچائی سے اعتراف کر لیا کہ بلو اس کی بہن نہیں، بلو ایک جوان لڑکی ہے۔۔۔۔۔۔۔خوبصورت، پرکشش جوان جسم کا نام بلو ہے۔

وہ پریشان ہو گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے نکل گیا۔ دن ڈھلے گھر لوٹا تو قادرا اور اس کی ماں دالان میں بیٹھے تھے۔ اور ماں قادرے کی ماں سے باتیں کر رہی تھی۔ نوراں باہر چولہے کے پاس بیٹھی حلوہ بنا رہی تھی اور بلو دالان میں چھلے ہوئے مالٹے لے کر ماں کو دینے گئی تھی۔

اس نے دالان میں قدم رکھا تو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔

قادرا اور بلو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے تھے۔ یہ مسکراہٹ اتنی تیز اور ایسی تند تھی کہ فضل کو لگا برچھی سینے میں اتر گئی ہے۔

وہ جلدی سے آگے بڑھا۔

''ادھر لا'' سختی سے کہتے ہوئے اس نے پلیٹ بلو کے ہاتھ سے لے لی اور خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''چل باہر۔۔۔۔۔۔۔اور یہ بالے اتار دے اسی وقت''

سب اس کا منہ تکنے لگے۔

بلو تو ڈر ہی گئی۔ دبے پاؤں وہاں سے نکل گئی۔ مالٹوں والی تھالی اس نے چارپائی پر پھینک دی اور خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان کے جانے کے بعد ماں اس کے پاس آئی۔ وہ کھری چارپائی پر چت پڑا تھا۔

ماں پیار سے بولی۔ ''پگلے! یہ کیا ہوا تجھے؟''

''بلو قادرے کے سامنے کیوں گئی تھی؟'' وہ چلایا۔

''اے ہے' آہستہ بولو۔۔۔۔۔۔قادرا کوئی غیر نہیں ہے۔بلو کے چاچے کے پتر ہے۔نوراں نے بھی ہاں کردی ہے۔''

''کیا؟''

''گھر کی بات ہے بیٹے' کوئی رسم وسم نہیں کرنی۔ہاں اپنی رضامندی ہم نے ظاہر کردی ہے۔جب شادی کریں گے ساری رسمیں کرلیں گے۔''

وہ پتھرایا سا پڑا رہا۔

''اٹھ پتر۔۔۔۔۔۔جا بلو کو پیار دے۔اس وقت سے رو رہی ہے۔کبھی اونچی آواز سے تم نے بات نہیں کی اس سے۔آج ان لوگوں کے سامنے ڈانٹ دیا۔''

''اف'' اسے پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا۔چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہوئے اس نے سر دونوں ہاتھوں پر گرالیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' ماں پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''اٹھ۔۔۔۔۔۔جا منالے بہن کو رونہ پگلی رو رو کر مرجائے گی۔اٹھ میرا بچہ' اٹھ''

ماں نے اسے زبردستی اٹھایا اور بلو کے پاس بھیج دیا۔

وہ اس سے روٹھی ہوئی تھی' رو رو کر آنکھیں سرخ انگارہ کی ہوئی تھیں۔

وہ حسن کا یہ روپ دیکھ کر پہلے سے بھی کہیں زیادہ نڈھال اور بے حال ہوگیا۔بلو کو کچھ کہے بغیر دالان سے نکل آیا۔

اس کی بے چینی اور پریشانی دیدنی تھی۔

کئی دن اس کی یہی حالت رہی۔ماں نوراں سے کہتی۔''دیکھ اس پگلے کو۔۔۔۔۔۔جب سے سنا ہے کہ بلو کی بات ٹھہرادی ہے' پریشان ہی رہنے لگا ہے۔''

''خود میرا دل بھی بہت بے چین ہے بہن۔۔۔۔۔۔بلو کو جدا کرنے کا سوچتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔فضل نے بھی تو نازوں سے پالا ہے اسے۔۔۔۔۔۔افسردہ تو ہوگا ہی۔''

''ہاں' یہ بات تو ہے۔بہت اثر لیا ہے اس نے' ابھی سے سودائی بنا پھرتا ہے۔۔۔۔۔۔شادی کے بعد کیا کرے گا؟''

فضل واقعی سودائی ہوگیا تھا۔

دن کو چین آتا نہ رات کو آرام

اپنے آپ کو سمجھانے کی بھی ہر ممکن کوشش کی۔

بلو کو بہن سمجھنے پر بھی اپنے آپ کو بہت اکسایا۔

لیکن

وہ جو من تھا اس کا' بہک گیا تھا۔ کسی طور پر قابو ہی میں نہ آتا تھا۔ چیخ چیخ کر کہتا' بلو تیری بہن نہیں ہے۔ بلو بھی اس کو پریشان دیکھ کر پریشان ہو جاتی۔ روٹھی ہوئی تو وہ تھی' لیکن اس دن اس پر ترس آ گیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ بھی دھم سے اس کے قریب آ بیٹھی۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر سر اس کے کندھے سے لگا کر روتے ہوئے بولی۔ ''تم نے تو ابھی سے مجھے اپنے سے جدا کر دیا لالہ۔۔۔۔۔۔۔ شادی کے بعد تو پوچھے گا بھی نہیں۔ تو نے ایسا رویہ رکھا ویرا' تو تیری بہن مر جائے گی' مر جائے گی۔''

''بلو'' اس نے وحشیانہ انداز میں اسے بازوؤں میں دبوچ لیا۔

بلو گھبرا گئی۔ ڈر کر اپنا آپ اس کے بازوؤں سے چھڑاتے ہوئے ذرا پرے ہو بیٹھی۔

وہ ہنس پڑا۔

بلو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ہاں اسے ہنستے ہوئے دیکھا تو لمحاتی خوف دور ہو گیا۔ خوش ہو کر بولی۔ ''شکر ہے میرے ویر کو ہنسی تو آئی۔''

فضل کے اندر جو ناگہانی اور ایکا ایکی تبدیلی آئی تھی' وہ لاکھ کوششوں سے بھی اس پر قابو نہ پا سکا اور آج اس سے جو حرکت سرزد ہوئی تھی' اس سے تو وہ خود بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔

پھر

اس نے یہ بھی سوچا کہ ماں سے کہہ دے

نوراں سے کہہ دے

کہ

وہ بلو کو ٹوٹ کر چاہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ وہ اس کی بہن نہیں ہے' منہ بولے رشتوں کا بھرم وہ نہیں رکھ سکے گا۔۔۔۔۔۔۔ بلو اس کی ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس کی ضرورت ہے' وہ اسے چاہیے۔۔۔۔۔۔۔ قادرا اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔۔۔۔۔۔۔ وہ بلو کو قادرے کے حوالے نہیں کر سکتا۔

لیکن

اس پر بھائی کا رشتہ اس طرح مسلط کر دیا گیا تھا کہ بہادر' جیالا اور نڈر ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو اس تسلط سے آزاد نہیں کر سکا۔ ماں۔۔۔۔۔۔۔نوراں اور گاؤں کا بندہ بندہ جانتا تھا کہ وہ بلو کو بہن مانتا ہے' اسے بہن بنایا ہے۔

وہ ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔

اور بلو اپنی عمر کے تقاضوں سے حسین و رنگین خوابوں کو چن رہی تھی۔ قادر اس کے دل کی چوکھٹ میں فٹ بیٹھا تھا۔ اسے لگتا تھا برسوں سے وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ پہاڑی جھرنوں کی طرح گنگناتی پھرتی شوخی اور چنچل پن کچھ زیادہ ہی آ گیا تھا۔ چہرے پر شفق رنگ سرخیاں لہراتی تھیں اور ایسے میں جو کبھی قادر آ جاتا۔۔۔۔۔۔۔تو اس کے حسن پر نکھار آ جاتا' مسکراہٹوں میں بجلیاں بھر جاتیں۔

اسی لیے

اس نے اس دن سختی سے کہا۔ ''ماسی نوراں''

''کیوں پتر۔۔۔۔۔۔۔''

''قادرے کو کہہ دے' اس طرح دندناتا گھر نہ آیا کرے۔''

''کیوں پتر۔۔۔۔۔۔۔قادرا اپنا ہی بیٹا ہے' غیر تو نہیں۔''

''کہہ دیا نا۔۔۔۔۔۔۔''

''اچھا پترا تیری مرضی' کہہ دوں گی۔''

نوراں نے یہ بات شکایت بھرے لہجے میں اس کی امی سے کی تو وہ ہنس کر بولی۔ ''بھئی بھائی ہے' پسند نہیں کرتا شادی سے پہلے اس کا آنا جانا۔ جانتی تو ہے تو' وہ کتنا غیرت مند ہے۔''

نوراں نے قادر کو پیار سے سمجھا دیا۔

بلو کو فضل کی بات اچھی نہیں لگی۔

لیکن جذبوں میں کشش ہو تو ملن کی راہیں مسدود نہیں ہوتیں۔ دونوں نے اور راستے تلاش لیے۔ بلو کسی دن ددھیال چلی جاتی تو وہاں قادرا اسے مل جاتا۔

پھر انہوں نے ندی کنارے درختوں کے اس جھنڈ تلے ملنا شروع کیا جو غیر آباد بھی تھا سنسان بھی۔

فضل ابھی تک اپنی ذہنی الجھنوں سے نجات نہ پا سکا تھا۔ اب تو وہ پوری ڈھٹائی برت رہا تھا۔ بلو کو بہن تسلیم کرنے سے انکاری ہو گیا تھا۔

بلو کیا کوئی بھی اس کے اندر کی اس تباہ کن تبدیلی سے آگاہ نہیں تھا۔

ماں اور نوراں تو جہیز بنانے کی فکر میں لگی تھیں۔

بلو حسین و رنگین جالوں میں گرفتار تھی۔ قادرے کی معیت میں گزرا ایک ایک لمحہ ہزاروں خوشیوں پر محیط تھا۔ آج کل تو اس کا انگ انگ مسکراتا تھا۔ آنکھوں میں جیسے کسی نے کوٹ کوٹ کر ستارے بھر دیئے تھے۔ ہنسی کی پھوار ہر دم برستی رہتی۔

اس دن وہ باہر جا رہی تھی کہ فضل صحن ہی میں مل گیا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''سہیلی کے گھر''

''بڑی خوش نظر آ رہی ہو۔''

''لالہ''

''شادی کی خوشی ہے۔''

''ہائے لالہ۔۔۔۔۔۔۔آپ یہ باتیں مجھ سے کیوں کرتے ہیں؟''

وہ اس کی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''قادرا بہت پسند ہے تجھے؟''

''ہائے۔۔۔۔۔۔۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ لیکن اس کی مسکراہٹیں بکھر رہی تھیں۔

''بہت اچھا لگتا ہے وہ۔۔۔۔۔۔۔؟'' فضل نے اس کی کلائی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کا بازو نیچے کیا۔

وہ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

''بتا۔۔۔۔۔۔۔'' وہ سختی سے بولا۔

''لالہ کیسی باتیں کرتے ہو مجھ سے۔۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔۔۔یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ وہ تجھے زیادہ ہی اچھا لگنے لگا ہے' مجھ سے بھی زیادہ۔۔۔۔۔۔۔''

وہ شرمیلی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے اس کے کندھے سے جا لگی۔ ''لالہ۔۔۔۔۔۔۔آئندہ ایسی باتیں مت کرنا۔''

''تو بتا' وہ مجھ سے بھی زیادہ اچھا لگتا ہے؟''

''تم تو میرے ویر ہو' پیارے ویر'' وہ اس سے الگ ہو کر تقدس بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور وہ۔۔۔۔۔۔۔؟'' وہ غرایا۔

''وہ۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔وہ میرا۔۔۔۔۔۔۔سب کچھ'' وہ شوخی سے کہتے ہوئے ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔

فضل کے دل پر کیا بیتی' اس کے سوا کوئی نہ جان سکا۔

پھر

اس کے ارادے خوفناک ہو گئے۔

اس کے فیصلے تباہ کن ہو گئے۔

بلو قادرے کی نہیں ہو سکتی تھی۔

فضل کے ہوتے ہوئے قادرے کی نہیں ہو سکتی تھی۔

اور

اور

اب جو کچھ ہوا تھا

اس کے خوفناک ارادے اور تباہ کن فیصلے ہی کا نتیجہ تھا۔

بلو کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔

فضل کلہاڑی لیے اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

قادرا بھاگ گیا تھا۔

لوگ ایک غیرت مند بھائی کی شان میں قصیدہ پڑھ رہے تھے۔

لیکن

یہ تو وہی جانتا تھا

کہ

یہ قتل

ایک غیور بھائی نے غیرت کی للکار پر نہیں کیا

بلکہ

ایک جوان مرد نے جوش رقابت میں بلو کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

◆◆◆

جہیز کی سولی

لیٹے لیٹے K-2 کی ڈبیہ میں سے اس نے آخری سگریٹ منہ میں دبایا۔ ڈبیہ پرے پھینک کر سرہانے تلے سے ماچس نکالی۔ سگریٹ سلگایا اور بے اطمینانی کا کش لیتے ہوئے دھواں اندر کھینچ لیا۔

''سگریٹ پہ سگریٹ پیتے چلے جا رہے ہو' یوں تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔'' زینے نے تنگ آ کر کہا۔

''تو بتاؤ میں کیا کروں؟'' بڑی تلخی سے حمید نے کروٹ اس کی طرف بدل کر کہا۔

''میں کیا بتاؤں؟''

''پھر؟''

''پھر کیا۔۔۔۔۔۔۔ کرنا تو ہے ہی۔ کسی دوست یار سے قرض لے لو۔ بہن بھائیوں سے مانگو' دے ہی دیں گے واپس ۔۔۔۔۔۔۔ یہ وقت تو نکل جائے۔''

حمید نے ایک گہری سانس کھینچی۔ پھر چت لیٹ گیا۔ سگریٹ کے کش پہ کش لیتے ہوئے تلخ اور کڑوا دھواں اگلنے لگا۔

''ساری عمر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ سمجھ نہیں آتا' کیسے مانگوں قرض۔'' اس نے کئی لمحوں کا کرب سمیٹتے ہوئے کہا۔

زینے اٹھ بیٹھی۔ اس کی طرف رخ کرتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ''مجبوری ہے۔''

''ہاں' مجبوری ہے۔ لیکن سوچتا ہوں' یہ مجبوری کتنی دفعہ دہراؤں گا۔ ایک دو نہیں پوری چھ بیٹیاں ہیں۔''

''پہلی کو تو نبھا لو' باقیوں کو بھی دیکھیں گے۔ اللہ مالک ہے۔ جس نے دی ہیں وہی نپٹائے گا۔''

''شاید۔۔۔۔۔۔''

''اپنے بڑے بھائی سے مانگ لو نا' ان کے پاس کیا کمی ہے۔ کھانے والا تو کوئی ہے نہیں۔ پھر ہم رکھ تھوڑا ہی لیں گے۔ لوٹا دیں گے۔''

''کیسے؟''

''اب یہ بھی اسی وقت سوچنا ہے؟''

''تمہارے دونوں صاحبزادے کسی قابل ہوتے تو۔۔۔۔۔۔''

''سارے نشتر ابھی چبھولو۔ بیٹے کسی قابل نہیں ہو سکے تو میرا کیا قصور۔۔۔۔۔۔۔شروع سے انہیں قابو میں رکھا ہوتا۔ صحیح ذمہ داری سنبھالی ہوتی تو آج بیکار اور آوارہ نہ پھر رہے ہوتے' بازو بنتے تمہارے۔''

''میں تمہیں دوش تو نہیں دے رہا زینے' صرف دکھ کا اظہار کر رہا ہوں۔ تاجی کی شادی ہے' دونوں کو کچھ احساس نہیں۔ اتنا پتہ ہے کہ اچھا کھانا ہے اور ٹش فش نکال کے باہر نکلنا ہے۔''

''ان کو چھوڑو' یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے۔ شادی میں کل پچیس دن رہ گئے ہیں۔ کیا کچھ کرنا ہے ابھی۔۔۔۔۔۔''

''جانتا ہوں' کم از کم بارہ چودہ ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ معمولی سا فرنیچر بھی لیا تو بات تین چار ہزار روپے تک پہنچے گی۔ بارات کا۔۔۔۔۔۔ پچاس باراتی ہوں گے' پچاس ساٹھ اپنے بھی ہو جائیں گے۔''

''ابھی سٹیل کے برتن بھی لانے ہیں' کپڑوں کی سلائی بھی دینی ہے۔ زیور زیادہ نہ سہی۔ کانوں کے بندے اور ایک انگوٹھی تو ہو ہی جائے۔''

''لڑکے کی انگوٹھی بھی بنوانی ہے۔''

''ہاں۔۔۔۔۔۔ بارہ چودہ ہزار تو لگ ہی جائے گا۔ چھوٹی موٹی چیزیں سوئی سلائی کپڑے لتے تو نکل ہی آئے ہیں۔ تنکا تنکا جوڑتی رہی ہوں عمر بھر۔۔۔۔۔۔ وہ بھی خریدنا پڑتا تو۔۔۔۔۔۔''

''تو بارہ چودہ ہزار کی جگہ بیس پچیس ہزار قرضے میں لینا پڑتا۔۔۔۔۔۔ کیا فرق پڑتا۔''

''تاجی کے ابا! تشنیع مت کرو' پیسے کا بندوبست کرو۔ بس لڑکی خیریت سے رخصت کر دیں تو سمجھیں بہت معرکہ مار لیا ہے۔ قرضہ بھی اتار ہی لیں گے کسی نہ کسی طرح۔''

''اتنی آمدنی میں تو اترنے سے رہا۔ روٹی مشکل سے چل رہی ہے اسی لیے تو قرض مانگتے ہوئے جھجک رہا ہوں' اتاروں گا کیسے۔۔۔۔۔۔ اور پھر بار بار قرضہ۔۔۔۔۔۔''

زینے نے دکھ سے حمید کی طرف دیکھا وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ ایک نہیں' چھ بیٹیاں تھیں۔ پہلی کی شادی کرنا تھی۔ زینے نے جو کچھ سنبھال کر رکھا ہوا تھا' اب کام آ گیا تھا۔ لیکن دوسری کی شادی پر تو یہ بھی نہیں ہو گا۔ سب کچھ بنانا پڑے گا' خریدنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔ کہاں سے؟ سوچ سوچ کر عقل بے دم ہو جاتی تھی۔

لیکن زینے دور کی سوچنے کی قائل تھی۔ آئندہ کیا ہوگا۔ اسے آئندہ پر چھوڑنا تھا۔ فی الحال تو اسے فکر اسی شادی کی تھی۔ دس بارہ ہزار قرضہ لینے کی تھی۔ جس کے اتارنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں تھی۔

تاجی کا رشتہ اتفاقاً ہی طے ہو گیا تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا نعمان ۔۔۔۔۔۔۔ چھوٹا سا کاروبار تھا۔ جس کے بڑھنے پھیلنے کی توقع تھی۔ نعمان کی ماں اور بہنوں نے تاجی کو دیکھا اور پسند کر لیا۔ دو چار پھیرے ڈالے گھر بار اور گھر والے سبھی انہیں اچھے لگے۔ زینے نے ظاہر داری رکھی تھی۔ صفائی ستھرائی میں جواب نہیں تھا۔ آئے گئے کی خاطر تواضع بھی دل سے کرتی تھی۔ مالی حالات تنگ دستی کی نشاندہی کرتے تھے لیکن اس نے یہ بات کبھی بھی کسی دوسرے پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ بیٹیوں کو پڑھایا لکھایا بھی تھا۔ تاجی بھی دس جماعتیں پاس تھیں۔ دوسری نے بھی پچھلے سال میٹرک کر لیا تھا۔ باقی بھی پڑھ رہی تھیں۔ ظاہر داری کا بھرم وہ اور اس کے بچے پوری پوری طرح قائم کئے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عزیز رشتہ دار بھی ان کی مالی مشکلوں سے آگاہ نہیں تھے۔ بیٹوں کے معاملے میں یہ ان کی کم نصیبی تھی۔ دونوں ہی بے کار پھرتے تھے۔ تعلیم میٹرک تک تھی لیکن نوکریاں اونچی چاہتے تھے۔ شاید ظاہر داری کے بھرم نے ان کی ذہنی اڑان بہت ہی اونچی کر دی تھی۔ دونوں ہی آج کل باہر جانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ لیکن بنا پیسے جانے کے خواب ادھورے ہی تھے۔ فرسٹریشن میں وہ آوارگی اختیار کر رہے تھے۔

تاجی اپنے گھریلو حالات سے لاعلم نہ تھی۔ بڑی حساس لڑکی تھی۔ ماں باپ کو پریشان دیکھ دیکھ کر دل کڑھتا تھا۔ لیکن جواں لڑکی کی شادی ہو رہی تھی اور ان دیکھے سپنے اس کی آنکھوں میں بھی اتر رہے تھے۔ ایک نئی زندگی کا تصور اس کے انگ انگ میں نشاط کی لہریں دوڑا رہا تھا۔ نعمان کو اس نے دیکھا نہیں تھا۔ صرف تصویر دیکھی تھی۔ پھر بھی تصوراتی شہزادہ بن گیا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر اس کی تصویر دیکھا کرتی۔ اس سے باتیں کرتی۔ شرماتی' بھاتی' ناز نخرے کرتی ۔۔۔۔۔۔۔ کتنی خوبصورت تھی اس کے خوابوں کی دنیا۔ حسن ہی حسن تھا' رنگ ہی رنگ تھا' روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔

شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سب بہنیں مل کر کپڑے سی رہی تھیں۔ کوئی گوٹا لپا ٹانک رہی تھی۔ کوئی موتی تارے لگا رہی تھی۔ بازار سے تو کام کروانے کی حیثیت نہیں تھی۔ سلائی' کڑھائی گھر پہ ہی ہو رہی تھی۔ صرف عروسی جوڑا ہی بازار سے بنوایا تھا۔ لال ساٹن کے جوڑے پر گوٹے کا جال بنا تھا۔ سرخ دوپٹے پر بھی ویسا ہی لہریا جال لگوایا تھا۔ ایک جوڑے پر ہی اتنے پیسے خرچ ہو گئے تھے کہ کسی اور کپڑے پر کام کروانے یا درزی سے سلوانے کی ہمت ہی نہ ہوئی تھی۔ بہنیں ہی تاجی کے ساتھ مل کر کپڑے سجا بنا رہی تھیں۔ کتنی خوشی تھی سب کو تاجی آپا کی شادی کی۔

اس دن سب کمرے میں جمع تھیں۔ نازو گھڑ گھڑ مشین چلا رہی تھی۔ شبو دوپٹے پر تارے ٹانک رہی تھی۔ سلمٰی اور جازی کپڑے تہہ کر کے تاجی کو دے رہی تھیں جو جوڑے ٹانک ٹانک کر لوہے کے بکس میں رہی تھی۔

سلمٰی نے اورنج فلیٹ کا جوڑا جس پر شبو نے تارے سجائے تھے۔ تاجی کی طرف بڑھایا۔ تاجی باجی یہ جوڑا جب آپ پہنیں گی نا' تو۔۔۔۔۔۔۔"

"تو کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔" جازی نے پوچھا۔

"تو پری لگیں گی آپ" سلمٰی بولی۔

"پاگل" شبو نے کاٹا۔

"کیوں؟"

"پری تو اس جوڑے میں لگیں گی۔" اس نے سبز دوپٹہ پھیلایا' جس کے کناروں پر وہ موتیوں سے بیل بنا رہی تھی۔

نازو مشین کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر اسے روکتے ہوئے بولی۔ "کمر ہماری ٹوٹ گئی ہے' پری یہ بنیں گی۔"

تاجی ہنس پڑی' اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نے ستارے کوٹ کر بھر دیئے تھے' بولی۔ "فکر نہ کرو' تمہاری باری آئے گی تو ہماری کمر ٹوٹے گی۔"

"ان کی باری بھی جلدی آئے گی۔" جازی نے کہا۔

"نمبر ۲ جو ہیں۔" شبو بولی۔ "اگلے سال یہ گئیں۔"

"تیسرا نمبر تمہارا ہے نا" سلمٰی ہنسیں۔ "یعنی اس سے اگلے سال جنابہ گئیں۔"

"تمہارے ابھی بہت سال ہیں۔" نازو نے سلمٰی کو چھیڑا۔

"کیا خبر۔۔۔۔۔۔۔" تاجی بولی۔ "تم سب سے پہلے اسی کا ہو جائے۔"

"کمال ہے۔"

"ہمارا حق مارے گی یہ"

"لگتا کچھ ہے مجھے" تاجی بولی۔ پھر شوخی سے ہنس کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری ساس کی اس پر نظر ہے۔ بہت پیار سے دیکھتی ہے اسے۔"

سب نے اس بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر نازو بولی۔ ''تاجی۔۔۔۔۔۔۔تاجی''

''ہوں''

''آپ کے سسرال والے ہیں اچھے لوگ''

''خدا کرے اچھے ہی رہیں۔''

''دیکھیں نا' ہماری مالی حیثیت کیا ہے۔ وہ خاصے پیسے والے لوگ ہیں' پھر بھی انہوں نے ہمارا گھر پسند کرلیا۔''

''قسمت کی بات ہے۔''

سب بہنیں کام کرتے ہوئے باتیں بھی کررہی تھیں۔ گھر میں پہلی شادی تھی۔ حالات موافق نہیں تھے۔ پھر بھی خوشی اپنی جگہ تھی اور تو اور اماں بھی جس کے سر پر چوبیس گھنٹے قرض کا بار تھا۔ جہیز بنتے سنورتے دیکھتی تو خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ پرانے زمانے کے سہاگ گیت بے سرے انداز میں گانے لگتی۔

بچیاں ہنستے ہنستے دوہری ہوجاتیں۔

ان دنوں تو دونوں بیٹے بھی سنجیدہ ہورہے تھے۔ مالی طور پر تو باپ کا ہاتھ نہ بٹا سکتے تھے۔ اوپر اوپر کے کام کرنے میں پیش پیش تھے۔ ناصر نے بارات کے کھانا پکوانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ جعفر بازاروں کے چکر لگا رہا تھا۔ کبھی منیاری کی دکانوں سے چیزیں لارہا ہے۔ کبھی منڈی سے چاول چینی اٹھوا کر گھر پہنچا رہا ہے۔

مہمانوں کی فہرست بھی دونوں بھائیوں نے ابو کے پاس بیٹھ کر تیار کی۔ قرضہ لے کر ابو کی کمر دوہری ہورہی تھی۔ دونوں کو اس بات کا دکھ تھا۔ وہ کسی قابل نہیں تھے' پھر بھی دونوں نے عہد کرلیا تھا کہ نازو کی شادی پر دونوں بھائی اپنی کمائی کا روپیہ خرچ کریں گے۔ اب تو تنگی سے ہی تیاری ہورہی تھی۔ آئندہ وہ کھلے دل سے شادیوں پر خرچ کر کے دل کے ارمان نکالنے کا سوچ رہے تھے۔

نچلا متوسط طبقہ جتنے جہیز کا متحمل ہوسکتا تھا' تاجی کے لیے بھی بن گیا۔ چند جوڑے کپڑے' کانوں کے بندے اور انگوٹھی' دو بستر' تھوڑا سا فرنیچر اور تھوڑے بہت برتن۔ کچھ تو اماں نے اپنے جہیز کے تانبے کے برتن قلعی کروالیے' کچھ نئے اسٹین لیس اسٹیل کے خرید لیے۔

جہیز زیادہ نہیں تھا پھر بھی تاجی مطمئن تھی۔ سسرال عزیز اچھے دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے نہ تو کوئی چیز مانگی تھی نہ فرمائش کی تھی۔ زیبے نے بار بار ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔

''ہم آپ کے پلے کے نہیں ہیں۔ پھر بھی بیٹیوں کو خالی ہاتھ تو گھر سے وداع نہیں کیا جاتا۔ حیثیت سے بڑھ کر ہی دیں گے۔''

بارات مقررہ تاریخ اور وقت پر آئی۔ تاجی کے باپ اور بھائیوں کے علاوہ رشتہ داروں اور محلے داروں نے باراتیوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ خاطر مدارات کی۔ بچھ بچھ گئے۔ ایک ایک باراتی کے جیسے وہ غلام بنے تھے۔ کوشش یہی تھی کہ بیٹی کا معاملہ ہے۔ کسی باراتی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

گھر والے باراتیوں کی آؤ بھگت میں لگے تھے اور تاجی سہیلیوں میں گھری بیٹھی دلہن بن رہی تھی۔ سرخ گوٹے والا جوڑا پہنا تھا۔ چڑھاوے میں آیا۔ زیور بھی۔ سہیلیوں نے خوب شوخ میک اپ بھی کیا تھا۔

''بھئی تاجی!'' ایک سکھی اس کی آنکھوں کو مسکارے کا جل اور چمکی سے سجاتے ہوئے بولی۔ ''رونا دھونا نہیں ورنہ یہ سب کچھ بہہ جائے گا اور شکل۔۔۔۔۔۔''

''بھتنیوں کی سی لگنے لگے گی۔'' دوسری نے ہنس کر کہا۔

''آج کل کیوں نہیں روتا دھوتا۔ لڑکیاں شکر کرتی ہیں کہ شادی ہوئی۔۔۔۔۔۔ کیوں تاجی!'' تیسری نے اسے گدگدایا۔ جی تو اس کا بھر بھر آ رہا تھا' لیکن گدگدانے پر ہنس پڑی۔

سج بن کر تاجی کی شکل ہی بدل گئی۔ سادے اور سستی قسم کے کپڑے پہننے والی تاجی نے سرخ گوٹے سے بھرا جوڑا پہنا تھا۔ زیور سجایا تھا' میک اپ کیا تھا اور آنکھوں میں البیلے خواب سجائے تھے' دل کی دھڑکنوں میں پیار بسایا تھا۔۔۔۔۔۔ شکل بدلتی کیوں کر نہیں۔

شام ڈھلے وہ رخصت ہو کر سسرال آ گئی۔ چھوٹے بڑے اس پر ٹوٹ پڑے۔ سلامی کی رسم ہوئی۔ ساس نے اس کے گلے میں چھوٹا سا لاکٹ ڈال دیا۔ تاجی کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔

رات نعمان نے بھی اسے بریسلٹ کا تحفہ دیا۔ تاجی کا من خوشیوں کا گہوارہ بن گیا۔ اس کی آنکھوں میں سجے سپنوں کا حسن اور نکھر گیا۔ نعمان شاید اس کے تصوراتی شہزادے سے بھی اچھا تھا۔

دوسرے دن ولیمہ تھا۔ گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ دلہن شرمائی لجائی بیٹھی تھی اور ہر دیکھنے والا اسے سلامی دے کر اس کی تعریفیں کر رہا تھا۔ کتنی اہم ہو گئی تھی وہ آج۔

بہت خوبصورت بڑی پیاری ہے۔۔۔۔۔۔ بہت اچھی لگ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ کچھ اسی قسم کی باتیں تاجی کے کانوں میں

اتر رہی تھیں کہ کسی نے اس کی ساس سے کہا۔ ''اے نعیمہ! جہیز کہاں چھپا دیا ہے' سجایا نہیں۔ ہم بھی دیکھتے' کیا کچھ ملا ہے۔''

''دیکھنے کا نہیں خالہ' چھپا کے رکھنے کا ہے۔'' اس کی نند نے جواب دیا۔ تاجی کا دل ایک دم تھم سا گیا۔ پھر جلدی سے اس کی ساس بولی۔ ''جہیز تو زیادہ نہیں' ان لوگوں نے نقد روپیہ دیا ہے۔''

''کتنا۔۔۔۔۔۔۔؟'' دوسری عورت جلدی سے بولی۔

''پچیس ہزار''

''پچیس ہزار۔۔۔۔۔۔۔'' کئی متجسس اور حیرت زدہ آوازیں آئیں۔ بے اختیار ہو کر تاجی نے سب کو دیکھا۔ اس کا جی چاہا ابھی ساس سے پوچھے کہ واقعی ابا نے پچیس ہزار نقد دیا ہے۔

لیکن یہ ممکن کہاں تھا' قرض لے لے کر تو جہیز بنا تھا۔۔۔۔۔۔۔ یہ پچیس ہزار کہاں سے آیا؟

دوسرے دن وہ میکے گئی تو سب سے پہلے اماں سے یہی بات پوچھی۔ اماں کا جواب حسب توقع تھا۔ تاجی سمجھ گئی کہ معمولی جہیز کو چھپانے کے لیے اس کی ساس نے یہ بات لوگوں سے کہی ہے۔ اسے یہ بات اچھی نہ لگی۔ دو چار دن بعد جب ساس نے پھر کسی جہیز دیکھنے کی مشاق عورت سے یہی بات کہی تو عورت کے جانے کے بعد تاجی نے شاکی انداز میں کہا۔ ''اماں جی! آپ پچیس ہزار کا کیوں لوگوں سے کہتی ہیں جبکہ۔۔۔۔۔۔۔''

ساس نے ناگوار انداز میں دیکھا اور طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''جہیز جو لائی ہو' دکھانے کا ہے کسی کو۔''

تاجی کا دل دھک دھک کرنے لگا' آہستگی سے بولی۔ ''جتنی میرے باپ کی حیثیت تھی' اتنا ہی جہیز ملنا تھا۔''

''ہم نے بھی تو لوگوں کو منہ دکھانا تھا' کنبے برادری والے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری عزت ہی بنائی ہے میں نے۔''

تاجی چپ ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آئے لیکن اس نے پی لیے۔ یہ عزت بنی تھی یا بے عزتی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ بجھ سی گئی۔

اس کی افسردگی کو نعمان نے محسوس کیا۔ اس سے پوچھا تو وہ ٹال گئی لیکن جب مسلسل اصرار ہوا تو وہ رو پڑی۔

''آپ لوگوں نے ہمارا گھر بار دیکھا تھا' ہمارے مالی حالات کا بھی آپ کو علم تھا۔ جتنا جہیز میں لائی ہوں وہ بھی میرے مجبور والدین نے جانے کس طرح بنایا۔''

وہ روتے روتے اپنے والدین کی مالی حالت بتانے لگی۔ نعمان نے اسے تسلی دی۔ ''میں اماں سے کہہ دوں گا' آئندہ وہ پچیس

ہزار کا ذکر نہ کریں۔"

اماں سے کہنا تھا کہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نعمان کو چھوڑ کر وہ بہو کے گرد ہو گئیں۔

"لگائی بجھائی ابھی سے شروع کر دی۔ دو چار دن ہی میں پر پرزے نکالنے لگی ہو۔ میں نے کون سی بری بات کی' عزت بنائی تمہاری۔۔۔۔۔۔۔ شوہر کے کان بھی بھر دیئے۔"

تاجی تو ششدر سی رہ گئی۔ اس نے اپنی صفائی میں دو چار جملے کہے ان کا الٹ مطلب لے کر ساس صاحبہ نے وہ لتے لیے کہ رو رو کر وہ بے حال ہو گئی۔

دکھ تو اسے اس بات سے ہوا جب نعمان نے بھی ماں کی طرفداری کرتے ہوئے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔ "تم نے تو بات کا بتنگڑ بنا لیا ہے۔ اماں نے واقعی تمہاری اور تمہارے والدین کی عزت بنانے کو ہی کہا تھا' ہرج کیا تھا۔"

بات آئی گئی تو ہو گئی' لیکن ساس بہو کا روایتی ڈرامہ شروع ہو گیا۔ تاجی اکیلی اور ادھر پورا کنبہ۔ ساس' دونوں نندیں' دیور اور کبھی کبھی سسر بھی شامل ہو جاتے۔ بات معمولی سی ہوتی' لیکن کھینچا تانی شروع ہو جاتی۔

تاجی نے مہینے بعد ہی گھر کا کام کاج شروع کر دیا تھا۔ کھانا بنانا' صفائی کرنا' برتن دھونا' سبھی کچھ تو کرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی بہت تھک جاتی۔ نندیں تو کام کے قریب بھی نہ پھٹکتیں تھیں۔ تاجی کو یوں لگتا' اس گھر میں وہ بہو نہیں بلا تنخواہ نوکرانی بن کر آئی ہے۔ کبھی نندوں سے بھولے سے کہہ بھی دیتی۔ "یہ کام تم کر لو' میں آج بہت تھک گئی ہوں۔"

تو ساس فوراً کہتی۔ "میکے میں تو نوکرانیاں کرتی تھیں نا کام جو یہاں کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی شکایت لگا لو شوہر سے۔"

وہ چپ ہو جاتی۔

بات بات پہ طنزیات' بات بات پہ لڑائی کا امکان۔۔۔۔۔۔۔ تاجی بوکھلا سی جاتی۔

اس دن اس نے نعمان کے کہنے پر کھیر بنائی۔ کھیر وہ بہت اچھی بنایا کرتی تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگا کر اس نے کھیر تیار کی۔

اماں کو گوارہ کہاں تھا کہ شوہر فرمائش کرے اور تاجی اس فرمائش کے لیے جٹ جائے۔ کھیر بن گئی تو تاجی نے اماں سے کہا۔

"اماں جی! کوئی بڑا پیالہ دے دیں' اس میں ڈال دوں۔ کھانے تک ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"جہیز میں جو پڈنگ سیٹ لائی ہو نا' اس کا نکال لو پیالہ۔" ساس نے طنز کا تیر چلایا۔

تاجی کا دل جل گیا۔ طنز تیر کی طرح ترازو ہو گیا دل میں۔ بیچاری کو پڈنگ سیٹ ملا ہی کہاں تھا جہیز میں۔

اس کا جی چاہا کہ ساری کھیر نالی میں انڈیل دے۔ کم جہیز لانا اتنا بڑا جرم تھا کہ قدم قدم پر طنز کے کانٹے بکھیرے جا رہے تھے۔

وہ کھیر دیگچی ہی میں چھوڑ کر باورچی خانے سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر پر گر کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

شام کھانے کے بعد کھیر دیگچی ہی میں نعمان کے سامنے رکھی گئی۔

''اماں دیگچی میں کھیر۔۔۔۔۔۔۔ جمادی ہوتی پیالے میں۔''

''یہ لوگ دیگچی میں بنا کر دیگچی ہی میں کھا لیتے ہوں گے اسی لیے تو پکا کر رکھ گئی تھی دیگچی ہی میں۔''

نعمان نے سرنا گوار انداز میں ادھر ادھر مارا۔ تاجی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

تین چار مہینے گزر گئے۔ تاجی جہیز کے طعنے خاموشی سے سنتی اور سہتی رہی۔ کبھی بہت دل بھر آتا تو چپکے چپکے رو لیتی۔ ماں اور بہن سے بھی کچھ نہ کہا۔ میکے کے حالات جانتی تھی۔ وہاں پہلے ہی کون سے سکھ بنتے تھے جو اپنا دکھ کہہ سن لیتی۔ ان کو تو اس نے یہی امپریشن دیا کہ وہ بہت خوش باش ہے۔

لیکن۔۔۔۔۔۔ ساس ہر بات پر اسے ہی نشانہ بناتی تھی۔ نندیں بھی نہ بخشتی تھیں۔ پھوہڑ اجڈ اور گنوار کے القاب ملنے لگے تھے۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اب وہ بھی جواب دینے لگی۔ جہیز کا کوئی طعنہ ملتا تو وہ فوراً جواب دیتی۔۔۔۔۔۔ پہلے تحقیق کر لینا تھی نا' کسی امیر گھرانے کا رخ کرنا تھا۔

اس کے جواب میں اپنے دفاع میں ہوتے تھے لیکن جواب سننے کی عادی ساس صاحبہ کہاں تھیں' بات کا بتنگڑ بنا لینا کونسی مشکل بات تھی۔

خوب لڑائی ہوتی۔

''نیچ گھرانے کی ہے نا' بڑوں کے سامنے زبان چلاتی ہے۔ ہماری قسمت جل گئی جو اسے بیاہ لائے۔''

ساس اٹھتے بیٹھتے کہتی۔

اب تو تاجی بھی تڑ تڑ جواب دینے لگی تھی۔

اس روز بھی معمولی سی بات پر جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا۔ تاجی نے اپنی قمیض ٹھیک کرنی تھی۔ اس کی چھوٹی نند مشین لیے بیٹھی تھی۔

''ذرا مجھے یہ پلیٹ ٹھیک کر لینے دو۔''

''نہیں بھابی! پہلے میں یہ شلوار سی لوں۔''

''تمہارا کافی کام ہے' میں نے بالشت بھر سلائیاں کرنی ہیں۔''

''بعد میں کر لینا' میرا موڈ بنا ہوا پہلے سی لینے دو۔''

''حد ہو گئی' دے دو تھوڑی دیر کے لیے۔''

''جہیز میں مشین لائی ہوتیں تو آرام ہوتا نا آج۔''

''تم لے کے جانا جہیز میں ہر چیز۔۔۔۔۔۔۔'' تاجی کا دل جل گیا۔

''وہ تو لے کے جائے ہی گی' کوئی کنگال تو نہیں ہم لوگ۔'' نند کی جگہ ساس نے تڑ سے جواب دیا۔

''بیٹوں کی کمائی پر عیش کر رہی ہیں نا۔۔۔۔۔۔۔ میرے بھائی بھی کماتے ہوتے۔۔۔۔۔۔۔'' تاجی کی بات تو ادھوری رہ گئی' ساس نے زمین آسمان ایک کر دیا۔

''بیٹوں کی کمائی کا طعنہ دیتی ہے مجھے' ہوتی کون ہے۔۔۔۔۔۔۔ لے جا اپنے شوہر کو' نہ دے کمائی مجھے وہ۔''

اللہ اللہ۔۔۔۔۔۔۔ کیا میدان جنگ وجود میں آیا۔

اتفاق ہی سے نعمان بھی اسی وقت گھر آیا۔ ماں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ ''کمائی کا طعنہ دیتی ہے مجھے۔۔۔۔۔۔۔ خبردار آئندہ کبھی مجھے ایک پیسہ بھی دیا تو نے۔۔۔۔۔۔۔ بیوی کا پیٹ بھریا اس کے پچھلوں کا۔''

''خبردار۔۔۔۔۔۔۔ جو میرے پچھلوں کا نام لیا۔'' تاجی بپھر گئی۔

''دیکھ۔۔۔۔۔۔۔ دیکھ لے اسے۔۔۔۔۔۔۔ کیسے تڑ تڑ جواب دیتی ہے۔'' ساس نے نعمان کا کندھا پکڑ لیا۔

''بات بات پر پچھلوں کا طعنہ۔۔۔۔۔۔۔ کیا بگاڑا ہے میرے پچھلوں نے تم لوگوں کا۔۔۔۔۔۔۔'' تاجی غرائی۔

ماں کے سامنے زبان چلاتے ہوئے آج پہلی بار نعمان نے تاجی کو دیکھا تھا۔ ماں رو رو کر شکایت کر رہی تھی۔ اسے تاجی پر بے طرح غصہ آیا۔ ڈانٹ کے انداز میں بولا۔ ''چپ رہو تاجی۔۔۔۔۔۔۔ شرم نہیں آتی' ماں کو یوں ٹڑ ٹڑ جواب دے رہی ہو۔''

''تم نے آج سنے جواب۔۔۔۔۔۔۔'' آج سسر کو بھی بیٹے کے کان بھرنے کا موقع ملا۔ ''دید لحاظ تو ہے ہی نہیں' بات سن ہی نہیں سکتی وہ۔۔۔۔۔۔۔ اس کے بھلے کی بات بھی کریں تو گلے پڑ جاتی ہے۔''

''ابا جی۔۔۔۔۔۔۔!'' تاجی نے چیخ کر کہا۔ ''خدا کا خوف کریں ابا جی۔۔۔۔۔۔۔ کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟''

''لو' سن لو۔۔۔۔۔۔۔ باپ کو بھی جھوٹا کہلوایا۔'' اماں نے گالوں پر ہاتھ مارے۔ ''تیری شہہ ہے ساری' سامنے کھڑا بے عزتی

کروار ہا ہے۔"

"اس کی اتنی جرات کہ ہمارے باپ کو جھوٹا کہے۔" کہیں سے دیور بھی آن ٹپکا۔ "بے غیرت ہو گئے ہو تم۔۔۔۔۔۔۔"

نندیں بھی ماں باپ کی طرف داری کرتے ہوئے تاجی کی شکایتیں کرنے لگیں۔ انہوں نے بھی نعمان کو اکسایا۔ تاجی کس کس کی بات کا جواب دیتی' کیا صفائی پیش کرتی۔ اس نے بھی سوچا' آج نعمان کے سامنے بات ہوئی ہے تو اسے بھی فیصلہ کر لینے دے۔ ایک کے مقابلے میں پورا خاندان ڈٹا ہے۔ نعمان بیوقوف تو نہیں جو بات نہ سمجھ پائے۔

لیکن نعمان بے وقوف تھا یا نہیں۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت ماں باپ' بھائی بہنوں کے شکایتی انداز سے بھڑک اٹھا۔ اس نے تاجی کو ڈانٹا اور غصے میں ایک تھپڑ بھی لگا دیا۔

تاجی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سب کے سامنے نعمان نے اسے گالیاں دی تھیں' تھپڑ بھی لگایا تھا۔ اتنی ذلت اور ایسی بے عزتی۔۔۔۔۔۔۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سب کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی تھی۔ اتنے دنوں سے انہیں یہی تو گلہ تھا کہ نعمان اپنی بیوی کو کچھ نہیں کہتا' سر چڑھا رکھی ہے' شہہ دیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ آج سب کو دلی خوشی ہوئی تھی۔

پھر تو یہ معمول ہی بن گیا۔ ہفتے عشرے میں ایک بار ضرور لڑائی ہوتی۔ اماں رو رو کر بیٹے سے شکایت کرتی۔ بیٹا غصے میں بھر جاتا۔ تاجی کو گالیاں دیتا' اسے ہی مورد الزام ٹھہراتا۔ اماں کی لگائی بجھائی پر اب تو اس نے بھی تاجی کو جہیز کے طعنے شروع کر دیئے تھے۔ تاجی کا دل ان طعنوں سے چھلنی ہونے لگا۔

اب تک جو کچھ ہوتا تھا' تاجی اپنے تک ہی رکھے ہوئے تھی' اماں یا بہنوں سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اس دن اماں کو بھی پتہ چل گیا۔ وہ اور نازو تاجی کے ہاں آئی تھیں' خاندان میں کسی کی شادی تھی۔ تاجی کو بھی بلاوا دینا تھا۔ یوں بھی کئی دنوں سے تاجی آئی نہیں تھی' دل اداس ہو رہا تھا' ملنے آ گئیں۔

اسی دن ساس بہو میں تکرار ہوئی تھی۔ ساس کا منہ پھولا ہوا تھا اور تاجی کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔

تاجی کی ماں کا تو دل دہل گیا۔ جب تاجی کمرے میں آئی تو پہلا سوال ہی یہی کیا۔ "لڑائی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔۔؟"

تاجی پھٹ پڑی۔ "کوئی آج ہی ہوئی ہے لڑائی' یہ تو اب روز کا معمول ہے اماں۔۔۔۔۔۔۔"

"کیوں؟" اماں حیرانگی سے بولی۔ نازو تو گنگ سی ہو گئی۔

''کیوں؟'' تاجی نے جل کر کہا۔ ''جہیز نہیں لائی تھی نا میں بہت بڑا۔۔۔۔۔۔۔ بہت قیمتی جہیز چاہیے تھا ان لوگوں کو۔ مایوسی ہوئی انہیں چار چیزیں دیکھ کر۔۔۔۔۔۔۔ اسی جرم کی سزا مل رہی ہے مجھے۔۔۔۔۔۔۔ اسی جرم کی سزا۔۔۔۔۔۔۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اماں کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ نازو بھی پریشان ہوگئی۔ وہ لوگ کتنے خوش تھے کہ تاجی اپنے سے اونچے گھر میں بیاہی گئی ہے' جہاں وہ شاداں وفرحاں زندگی گزار رہی ہے۔ انہوں نے تو اس گھرانے سے اور بھی امید وابستہ کر رکھی تھی۔

زینے بے حد دکھی ہوئی۔

واپس جانے سے پہلے اس نے تاجی کی ساس سے بڑے دل گرفتہ انداز میں کہا۔ ''بہن! تاجی آپ کی بیٹی ہے' اب ہمارا تو اس پر کوئی حق نہیں۔۔۔۔۔۔۔''

''اے ہے۔۔۔۔۔۔۔'' ساس بگڑ کر بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کیا سمجھانے لگی ہو' بیٹی کو سمجھاؤ نا' گز بھر کی زبان ہے جس کی۔ بڑا دیکھتی ہے نہ چھوٹا' بے عزتی کر کے رکھ دیتی ہے۔''

''کون۔۔۔۔۔۔۔ تاجی۔۔۔۔۔۔۔ تاجی۔۔۔۔۔۔۔؟'' نازو کے منہ سے نکلا۔ یہ بات قابل یقین جو نہ تھی۔

''ہاں جی۔۔۔۔۔۔۔ تاجی۔۔۔۔۔۔۔ تاجی'' ساس نے ناک منہ چڑھا کر نازو کی نقل اتاری۔

نازو کو وہ بہت بری لگی۔ وہ کچھ کہنے کو تھی کہ ماں نے ٹھوکا مارا تو چپ رہ۔

''چپ رہنے والی مٹی تیری بیٹیوں کو نہیں لگی۔'' ساس نے طعنہ دیا۔

''میں آپ سے لڑنے نہیں آئی بہن'' زینے نے جلدی سے کہا۔

''لڑا کا تو میں ہوں نا۔۔۔۔۔۔۔ لڑ رہی ہوں تجھ سے۔'' ساس نے ناگواری سے کہا۔

''میں نے کب کہا ہے بہن۔۔۔۔۔۔۔''

''کان بھر دیے ہیں بیٹی نے' اپنے کرتوت نہیں بتائے ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں ہی نشر کرتی پھرتی ہے وہ۔۔۔۔۔۔۔ بیٹے میرے کے زندگی اجیرن کر دی ہے' اس نے گھر کا سکون تباہ کر دیا ہے۔ کوئی لمحہ چین کا گزرتا ہی نہیں۔ میں اس وقت کو روتی ہوں جب تم لوگوں کے ساتھ ناطہ جوڑا تھا۔''

نازو کا جوان خون تپ گیا۔ ماں کے منع کرنے کے باوجود غصے سے بولی۔ ''نہ جوڑتے ہم سے ناطہ' اس وقت تو صدقے

قربان۔۔۔۔۔۔"

"چپ رہ نازو۔۔۔۔۔۔۔" زینے نے اسے ڈانٹا۔

"کمال ہے اماں' گھر آئے لوگوں کی بے عزتی کر رہی ہیں وہ اور آپ سنتی جا رہی ہیں۔"

"بے عزتی کرنے میں تو تم لوگ ماہر ہو۔ گھر آ کر بے عزتی کر رہی ہو۔ گھٹیا لوگوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے۔" ساس نے غصے سے لال پیلی ہو کر کہا۔

"چلو نازو۔۔۔۔۔۔۔" اماں نے غصے سے نازو کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"بڑی تو بڑی' چھوٹی اس سے بھی بڑھ کر ہے۔" ساس نے نازو کی طرف طنزیہ دیکھ کر کہا۔ "جہاں یہ جائے گی وہاں گھر کو جہنم ہی بنائے گی۔"

اب مزید کوئی بات کہنا یا سننا زینے کے بس میں نہیں تھا۔ تاجی کو خدا حافظ کہے بغیر وہ نازو کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل آئی۔

اس کا دل جل رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

زینے اور اس کے اہل خانہ اس روئیداد سے دکھی ہوئے۔ بھائی تو جوش غیرت میں یہاں تک کہہ اٹھے "مزہ چکھا دیں گے انہیں' کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں۔"

ماں نے دکھ سے کہا۔ "تم کسی قابل ہوتے تو یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ سارا بکھیڑا تو جہیز کا ہے جو انہیں ان کی حیثیت کا نہیں ملا۔"

"جہیز کی انسان سے زیادہ وقعت ہوتی ہے اماں؟" سلمٰی دکھی دکھی لہجے میں بولی۔

ابا بالکل خاموش رہے' کسی بات پر تبصرہ نہیں کیا' رائے نہیں دی' اظہار خیال نہیں کیا۔ وہ تو یہی سوچ رہے تھے کہ ابھی تو ایک ہی بیٹی جہیز کی سولی پر لٹکی ہے' ابھی تو پانچ باقی ہیں۔

یہاں تو دکھ ہی کا اظہار ہوا' بیٹی والے سوائے کڑھنے اور جلنے کے کر ہی کیا سکتے تھے' ردعمل تو تاجی کے ہاں ہوا۔

ایک نیا محاذ کھل گیا کہ تاجی نے ماں اور بہن کو بھڑکا کر ہماری بے عزتی کروائی ہے۔ اے ہے میں تو اس چھٹکی پر حیران ہوں' کیا زبان چلاتی ہے بالشت بھر کی لڑکی اور اتنی تیز طرار۔۔۔۔۔۔۔ اللہ میری توبہ! سب کی سب ایک جیسی ہیں۔

اب اٹھتے بیٹھتے تاجی کو نازو کے بھی طعنے ملنے لگے۔ گھر بیٹھی لڑکی کو یوں مشتہر کرنا کہاں کا انصاف تھا۔ تاجی سے برداشت نہ ہوتا' وہ جواباً نندوں کو کوستی' جن کی زبانوں کو کبھی لگام تھی ہی نہیں۔

معاملہ ٹھنڈا ہونے کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ اب لڑائی جھگڑا تاجی اور گھر والوں کے درمیان ہی نہیں تھا اس کے میکے والوں کو بھی درمیان میں گھسیٹ لیا جاتا۔ اس کے بھائیوں کو آوارہ اور بدکردار کہا جاتا۔ اس کے ماں باپ کو گالیاں دی جاتیں اور اس کی بہنوں کی زبانیں ہر آئے گئے کے سامنے گنی جاتیں۔

تاجی کا دماغ سوچ سوچ کر ماؤف ہو جاتا۔ کچھ سمجھ نہ پاتی کہ کیا کرے۔ ایک حل نظر آتا تھا کہ علیحدہ گھر لے لے۔ لیکن نعمان کا دل تو اس کی طرف سے پتھر ہی ہو گیا تھا۔ تاجی جب اس کا موڈ قدرے نارمل دیکھتی تو سمجھانے کی کوشش کرتی۔

لیکن

اثر کچھ بھی نہ ہوتا۔ نعمان بڑا بیٹا تھا' ماں باپ کو اس کی ضرورت تھی۔ پھر اتنا بڑا گھر تھا' اپنا گھر چھوڑ کر اسے کرائے پر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔

تاجی تنگ آئی ہوئی تھی۔ جب اس نے علیحدہ گھر لینے پر بہت ہی اصرار کیا تو نعمان نے جھڑک کر کہا۔ ''بہت تنگ آ چکی ہو تو اماں باوا کے پاس جا کر رہو۔ میں نہ یہ گھر چھوڑ سکتا ہوں نہ اپنے ماں باپ کو۔''

تنگ تو وہ واقعی آ چکی تھی' جہیز کی سولی پر جو لٹکی ہوئی تھی۔

لین

اماں باوا کے گھر نہیں جا سکتی تھی' نہیں جانا چاہتی تھی۔

ابھی اس گھر میں پانچ اور بیٹیاں تھیں جن کی شادیاں ہونی تھیں۔ اس کے برباد ہو کر وہاں جا بیٹھنے سے ان کی ڈولیاں اٹھنے کا چانس محدود ہو سکتا تھا۔ وہ ماں باپ کے سر سے اترا ہوا بوجھ تھی' اب دگنا بوجھ بن کر ان کی زندگی کو مزید تلخ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ساس کے ساتھ شوہر بھی اسے میکے بھجوانے کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔

لیکن

وہ وہیں تھیں۔

جل جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ مقابلہ کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ہار مان کر چپ سادھ لی تھی۔ لیکن حالات سدھرے نہیں تھے۔

تاجی حالات کے وار سہہ سہہ کر مریل سی ہو گئی تھی۔ بھرا بھرا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ رنگت سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ آنکھیں ہر وقت سرخ اور متورم رہتی تھیں۔

ان آنکھوں میں جو خواب سجے تھے جو سپنے لہرائے تھے وہ ٹوٹ پھوٹ گئے تھے' ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ ان ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں میں چبھ گئی تھیں۔۔۔۔۔۔۔اور سپنوں سجی آنکھیں کرچیوں سے چبھنے سے لہولہان رہتی تھیں۔

ہمیشہ۔۔۔۔۔۔۔لہولہان!

◆◆◆

ذرا سی غلطی

بات تو اس نے ہولے سے کہی تھی' لیکن وہ اتنی دھماکہ خیز تھی کہ اس نے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس کیا۔ وہ اتنی سنجیدہ نہ تھی یا آواز ہی میں پتھریلا پن نہ ہوتا تو امی شاید سمجھتیں کہ شبی نے مذاق میں یہ بات کہی ہے۔

وہ جھٹ سے کہہ دیتیں۔ ''فضول باتیں منہ سے نہیں نکالا کرتے شبی' بدشگونی ہوتی ہے۔''

لیکن آج تو وہ ششدر سی رہ گئی تھی۔ صرف اس کا منہ تکے گئیں۔

شبی نے سفید دوپٹے کی بکل مار رکھی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن بھوری چٹانوں کی سختی محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی تو عجب طرح کی وحشت تھی۔ اذیت اور دکھ اس وحشت میں گھل مل گیا تھا۔

ابو دفتر جا چکے تھے اور امی اپنے بیڈ کور پھیلا رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تو وہ دونوں پنڈی سے آئے تھے۔ کافی لیٹ پہنچے تھے۔ شبی سو چکی تھی۔ اسی لیے نہ اس کے کمرے میں آئے تھے نہ بلا بھیجا تھا۔ ڈھیر ساری چیزیں ابھی ڈبوں اور لفافوں میں بندھی پڑی تھیں۔

شبی نے سلام کیا تو امی نے رخ پلٹے بغیر جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہونا۔۔۔۔۔۔۔ رات تمہیں جگایا نہیں' ہم کافی لیٹ آئے تھے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا' امی بیڈ کور ڈالتی رہیں اور وہ خاموشیاں نگلتی رہی۔

پھر امی اس کی طرف پلٹیں۔ جانے کیوں ایک دم وہ اسے لپٹا نہ سکیں' نہ ہی اس نے ایسا ارادہ ظاہر کیا۔

امی کا دل دھک سے رہ گیا۔ چھٹی حس بعض اوقات خطرے کے الارم کی طرح بج اٹھتی ہے۔ وہ اس الارم کو بمشکل سن پائی تھیں کہ شبی نے ہولے سے کہا۔ ''امی۔۔۔۔۔۔۔ میں شادی نہیں کروں گی۔''

امی تو ''کیوں'' بھی نہیں کہہ سکیں' پوری آنکھیں کھولے اسے تکے گئیں۔

امی اور ابو اسی کی شادی کے سلسلے میں پنڈی' شاپنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ چند دن پہلے وہ خود اپنی پسند کی کوسمیٹکس اور کپڑے لینے وہاں گئی تھی۔ اب بھی اس نے چھوٹی بڑی چیزوں کی لمبی سی فہرست بنا کر انہیں دی تھی۔ پنڈی سے سامان خریدنے میں بڑی آسانی رہتی تھی۔ ایک تو فارن چیزیں وہاں سہولت سے مل جاتی تھیں دوسرے اکرم چچا کا وہاں گھر تھا' رہنے کی کوئی پرابلم نہ تھی۔

آرام اور آسانی سے شاپنگ کی جاسکتی تھی۔ وہ بڑے چاؤ اور پیار سے شبی کے لیے چیزیں خرید کر لائے تھے۔ اکلوتی بیٹی کے لیے صاحب حیثیت والدین جتنی بھی سہولت اور آسائش کی چیزیں خرید سکتے تھے' خرید رہے تھے۔

رات بھی وہ تین دن کی مصروفیت کے بعد بہت سی قیمتی' نایاب اور غیر ملکی چیزیں جو اس شہر میں آسانی سے نہ مل سکتی تھیں' خرید کر لائے تھے۔

وہ تین دن بعد آئے تھے۔

اور یہ تین دن شبی نے اپنے کمرے میں بند رہ کر گزارے تھے۔ وہ تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی تھی اور کبھی خاموش نگاہوں سے خلا میں تکتے ہوئے ان گنت سوچوں سے دوچار رہی تھی۔ اس نے نہ تو کپڑے بدلے تھے نہ ہی ڈھنگ سے کھانا کھایا تھا۔ وہ تو اماں صابراں ہی تھی جو پیار سے چائے کے چند گھونٹ یا روٹی کے دو چار نوالے زہر مار کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اماں صابراں اس گھر کی پرانی اور وفادار خادمہ تھی۔ شبی کے ابو اسلم صاحب کو اس نے گود کھلایا تھا۔ اب کام کاج کرنے کے قابل تو نہ تھی پھر بھی غنیمت تھی۔ گھر بار کی رکھوالی اس سے زیادہ اور کون کر سکتا تھا۔ گھر میں اور بھی نوکر موجود تھے' کام کاج وہی کرتے تھے' اماں صابراں تو ان کی نگران تھی۔

ایک دن تو اماں صابراں کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کمرے میں بند ہو کر رہ گئی ہے' دوسرے دن جب اللہ دتہ کھانا لگا کر اسے بلانے گیا اور اس نے کھانے سے انکار کر دیا تو وہ اماں صابراں کے پاس آیا۔

''اماں صابراں! چھوٹی بی بی کو کیا ہوا ہے؟''

''کیوں بے۔۔۔۔۔۔۔ کیا ہوا ہے؟'' اماں صابراں نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔

''پتہ نہیں' کل رات بھی کھانا نہیں کھایا' صبح ناشتہ بھی نہیں کیا اور اب کھانے۔۔۔۔۔۔۔''

اماں صابراں کے تو جیسے کسی نے دل پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہڑبڑا کر چوکی سے اٹھیں۔ چادر گھسیٹے گئی۔ وہ دھپ دھپ قدم رکھتیں اس کے کمرے میں جا پہنچیں۔

''اے شبی بیٹی' کیا بات ہے۔۔۔۔۔۔۔ کھانا کیوں نہیں کھایا میرے لال نے؟'' وہ اس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے اس پر جھک گئیں۔ اس کے کندھوں تک تراشیدہ بال بکھرے تھے اور وہ تکیے پر بازو کے حلقے میں سر رکھے اوندھی پڑی تھی۔

اماں صابراں گھبرا گئی تھی۔

''کیا ہوا میرے پتر کو؟'' وہ اکثر روٹھی ہوئی شبی کو ''پتر'' کہہ کر ہی منایا کرتی تھی۔

لیکن آج وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اماں کے منانے پر بھی سر نہ اٹھایا تو اماں نے زبردستی اس کو کندھے سے پکڑ کر اونچا کیا۔

''کیا بات ہے پتر؟'' اس نے سرخ اور بھیگے چہرے کو اپنی چندھیائی سی آنکھوں سے دیکھا تو شبی اس کی گود میں سر رکھ کر بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

''اے ہے۔۔۔۔۔۔۔ میرا تو دل ہی دہل گیا تھا۔'' اماں صابراں اسے پیار کرنے لگی۔ پھر ہولے ہولے تسلیاں دیتے ہوئے بولی۔ ''لڑکیاں تو شادی کے نام سے پھول کی طرح کھل اٹھتی ہیں' ان کا انگ انگ ناچنے لگتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ رونا کاہے کا؟ خالہ ہی کے گھر تو جا رہی ہے۔ عمو جیسا لڑکا تو چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ مت رو میری بچی! ٹھیک ہے ماں باپ سے جدائی بھی بہت بڑی بات ہے' لیکن ہر لڑکی کو ایک نہ ایک دن دوسرے گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ لیکن تجھے کیا فکر تیرے لیے تو دوسرا گھر بھی بیگانہ تھوڑا ہی ہے۔ نہ ہی عمو بیگانہ' نہ ہی خالہ خالو بیگانے' اے۔۔۔۔۔۔۔ پھر اسی شہر میں تو سسرال ہیں' کیا فکر ہے' رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے اور۔۔۔۔۔۔۔ اور تمہارے ابو تمہیں جہیز میں گاڑی بھی تو اسی لیے دیں کہ جب میرے پتر کا دل اداس ہو' یہ بھاگی بھاگی آ جائے پوں پوں کرتی شبی رانی۔۔۔۔۔۔۔ ٹھیک سے چلانا آ گئی ہے نا گاڑی۔۔۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔۔۔ مجھے بھی سیر کراؤ گی نا؟ دیکھو بیٹا' تیز تیز نہ چلایا کرنا' مجھے تو عمو کا بھی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اسے بھی نہ چلانے دیا کرنا اتنی تیز گاڑی۔۔۔۔۔۔۔ ہوں!''

وہ اسے بچوں کی طرح چمکارتی بہلاتی پھسلاتی رہی۔ پھر اسی نے اسے چائے پلائی۔ دو چار لقمے کھلائے۔

دو دن وہی اسے زبردستی کھلاتی پلاتی رہی تھی اور آج اس نے بیگم سے بھی تو یہی کہنا تھا کہ لاڈو نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا' کھانے پینے کو تیاگ بیٹھی تھی۔

لیکن

اس کے امی سے کچھ کہنے سے پہلے ہی شبی نے ہولے سے کہہ دیا تھا۔

''میں شادی نہیں کروں گی امی''

امی کو دھچکا لگا تھا' دل و دماغ کے جیسے پرخچے اڑ گئے تھے۔ چند لمحے وہ بمشکل اپنی ٹانگوں پر کھڑی ہو پائی تھی۔ پھر بیڈ کے کنارے پر دھم سے گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے ان کے حلق سے صرف یہی نکلا تھا۔ ''کیا بات ہے شبی؟''

اور شبی نے پورے استحکام سے کہا۔ ''بات کچھ بھی ہو میں شادی نہیں کروں گی۔''

امی اس کے لہجے کی شدت سے کانپ گئی تھیں اور شبی جس طرح کمرے میں آئی تھی اسی طرح نکل گئی تھی۔

چند منٹ امی کچھ نہ کر سکیں۔ وہ تو اپنے چہرے کا رخ بھی نہ موڑ سکیں۔ اسی انداز میں بیٹھیں اسی انداز میں اسی طرف تکتی رہیں لیکن جب شبی کی بات کی سنگینی کو پورے حواس میں آ کر سوچنے کے قابل ہوئیں تو ان پر حیرانگی ٹوٹ پڑی۔

''میں شادی نہیں کروں گی امی'' ان کے کانوں میں جملہ گونجنے لگا۔ وہ اپنی حیرانگی پر قابو نہ پا سکیں اس جملے کی جیسے انہیں پوری طرح سمجھ نہ آئی تھی۔ اسے سمجھنے کے لیے انہیں شبی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھیں اور تیز تیز قدم اٹھاتے کمرے سے نکل گئیں۔

دوسرے لمحے وہ شبی کے کمرے میں تھیں۔

''شبی!'' بستر میں اوندھی پڑی تھی شبی کو انہوں نے پکارا۔ یہ پکار جس انداز کی تھی ضروری تھا کہ شبی اس کا پوری ہمت سے جواب دے۔ اس لیے وہ پہلی آواز پر ہی بستر میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

امی نے اسے غور سے دیکھا۔ آگے بڑھیں۔ شبی نے بھی انہیں دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''کیا بات ہے بیٹی؟'' امی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا۔

شبی کمال صبر و ہمت سے بولی۔ ''کچھ نہیں۔''

''پریشان ہو؟''

وہ پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

''ہوا کیا ہے؟'' امی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''کچھ نہیں، کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ کچھ نہیں ہوا۔'' کہتے ہوئے شبی نے دانت ہونٹوں میں گاڑ لیے۔ دوسرے لمحے وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

امی بے طرح گھبرا گئیں۔ ان کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔ ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ بمشکل حلق میں پھنسی آواز نکالتے ہوئے بولیں۔ ''ہوا کیا ہے بتاتی کیوں نہیں ہو۔''

انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ شبی رو دی۔

''میری جان' میری بچی! کچھ تو بتاؤ۔''

''کچھ نہیں امی'' وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔''میں شادی نہیں کروں گی۔۔۔۔۔۔۔بس کہہ دیا نا۔''

''کیوں نہیں کرے گی؟'' امی نے جھٹکے سے اسے سینے سے الگ کرتے ہوئے جذباتیت پر قابو پا کر کہا۔

''بس۔۔۔۔۔۔۔''

''سیدھی طرح جواب دو شبی۔۔۔۔۔۔۔کیا بات ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔۔جانتی ہو تمہاری بات کا مطلب کیا ہے؟''

''جانتی ہوں۔''

''پھر۔۔۔۔۔۔۔؟''

''بس' میں شادی نہیں کروں گی۔''

امی کچھ دیر چپ چاپ تکتی رہیں' پھر بولیں۔''شادی میں صرف تین ہفتے باقی رہ گئے ہیں اور یہ شادی تمہارے ماں باپ سے زیادہ تمہاری مرضی۔۔۔۔۔۔۔''

''امی! بس۔۔۔۔۔۔۔میں نہیں کروں گی شادی۔۔۔۔۔۔۔نہیں کروں گی۔۔۔۔۔۔۔'' وہ بلک بلک کر رو پڑی۔امی کچھ نہ سمجھ پائیں۔حیران بھی ہوئیں' پریشان بھی' فکرمند بھی ہوئیں اور غصہ بھی آیا۔لیکن شبی کے رونے دھونے اور شادی سے انکار کی وجہ سمجھ نہ سکیں۔

''ہوا کیا ہے؟''

''کسی نے کچھ کہہ دیا؟''

''عمو کے بارے میں کوئی بات پتہ چلی؟''

''لڑائی ہوئی ہے عمو سے؟''

''خالہ کی کسی بات سے بدظن ہوئی ہو؟''

''خالو نے کچھ کہا ہے؟''

''شادی کے متعلق کسی نے ڈر خوف بٹھا دیا ہے تمہارے ذہن میں؟''

جتنی ممکنہ وجوہ تھیں امی نے ان کا اظہار کر دیا لیکن شبی نے تو نہ ہی انکار سے انحراف کیا نہ ہی ان وجوہ میں سے کسی کا اقرار کیا۔

آنسو خشک ہوئے تو سینے میں ہچکیوں کے بے آواز سے جھٹکے لگتے رہے' کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔ امی کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

امی بیچاری تھک ہار بیٹھیں۔

پریشان پریشان سی وہ شبی کے کمرے سے نکل آئیں' سمجھ نہ پا رہی تھیں کیا کریں' کس سے پوچھیں۔ مضمحل سی لاؤنج میں آ بیٹھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد اماں صابراں ادھر آ گئی۔ علیک سلیک اور احوال پرسی کے بعد بولی۔ ''شبی کہاں ہے' ابھی جاگی نہیں؟''

''اپنے کمرے میں ہے۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تو پریشان کر دیا ہے اس لڑکی نے۔''

''ہا۔۔۔۔۔۔۔ آج بھی وہ۔۔۔۔۔۔۔''

''اسے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔''

''ہاں بیگم صاحبہ' بہت پریشان ہے بیٹا' دو دن سے تو کھانے پینے کا بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ تو میں ہی بہلا پھسلا کر۔۔۔۔۔۔۔''

''تو یہ دو دن سے پریشان ہے۔''

''جس دن آپ لوگ گئے اس دن تو پتہ نہیں' دوسرے دن اللہ دتہ نے بتایا ہے کہ بٹیا کھاتی ہے نہ پیتی' بس روئے جاتی ہے۔''

امی چند لمحوں کو چپ ہو گئیں۔ کوئی بات تو ہوئی تھی' یہ احساس ہو گیا تھا لیکن بات کیا ہوئی تھی' کون بتاتا۔۔۔۔۔۔۔ ہیر پھیر کر یہی خیال آتا کہ عمو سے لڑائی ہوئی ہو گی۔ لیکن ان کی لڑائی اتنی سنگین بھی ہو سکتی ہے' یہ بات ناقابل یقین سی تھی۔ شادی سے انکار معمولی بات تو نہ تھی۔

جبکہ یہ شادی والدین کی مرضی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی پسند اور مرضی سے طے پائی تھی۔ دونوں کی محبتیں اور چاہتیں کسی سے مستور تو نہ تھیں۔

ان دنوں شبی سات آٹھ برس کی تھی' جب بڑی خالہ اور ان کے اہل خاندان کویت سے آئے تھے۔ وہ انہی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ خالو کا ارادہ اب بزنس کرنے کا تھا۔ دیار غیر میں رہتے ایک مدت ہو گئی تھی' اب پردیس کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ آئے تھے۔ بڑی دونوں بیٹیاں جوان تھیں۔ ان کے ہاتھ پیلے کرنا تھے۔ لڑکوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا۔ اس لیے یہیں کاروبار کرنے کا ارادہ تھا۔ عمو پانچ بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھا۔ تیرہ چودہ برس کا دبلا پتلا لمبا سا لڑکا تھا۔ شبی نے سب سے پہلے اسی کے متعلق پوچھا تھا۔ ''امی یہ کون ہے؟''

''یہ عمو ہے۔'' عمران نے سینے پر انگلی رکھ کر اس پھولے پھولے سرخ سرخ گالوں والی پیاری سی بچی کو بتایا تھا۔

''تم کون ہو؟'' عمو نے اسی طرح بھولا سا منہ بنا کر پوچھا۔

''یہ شبی ہے۔'' شبی بھی سینے پر انگلی رکھ کر عمران ہی کی طرح بولی۔

سب ہی ہنس پڑے۔

''کس کلاس میں پڑھتی ہو؟'' عمو نے اسے قریب بلا کر اس کی ٹھوڑی ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''تم کس کلاس میں پڑھتے ہو؟'' شبی نے بھی اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی۔

''شبی!'' امی نے ٹوکا۔ ''بیٹے! بڑوں کو تم نہیں کہتے' بڑے بھائی ہیں تمہارے۔''

''خیر ہے آنٹی'' عمو نے کہا۔

اپنی طرف داری کرنے والے اس لڑکے سے شبی کی دوستی ہوگئی۔

خالو نے کاروبار کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی' خالہ نے دونوں بیٹیوں کے رشتے کے لیے۔ یوں وہ انہی کے گھر میں رہنے لگے۔ کوٹھی وسیع و عریض تھی۔ اوپر والا حصہ بے مصرف ہی پڑا رہتا تھا۔ خالہ کے لیے اسے ٹھیک ٹھاک کروا دیا گیا۔ دونوں بہنیں بہت خوش تھیں۔

اور

ان سے زیادہ عمو اور شبی خوش تھے۔ دونوں میں بڑی پکی پکی دوستی ہوگئی تھی۔ شبی ایک اکلوتی ہونے کی وجہ سے بڑی لاڈلی تھی۔ یہ لاڈ وہ عمو سے بھی اٹھواتی تھی۔ عمو بھی تو اس کی ہر بات بے چوں و چرا مان لیتا تھا۔

''آؤ عمو' گڑیاں کھیلیں۔'' وہ عمو سے کہتی تو جھٹ سے کھیل کے لیے تیار ہو جاتا۔ دونوں کھلونوں والے کمرے میں آ جاتے۔ ڈھیر ساری گڑیاں اور ان کا ساز و سامان وہاں پڑا ہوتا تھا۔ دونوں مل کر یہ چیزیں شوکیس سے نکالتے۔ عمو ان کے لیے گھر بناتا۔ شبی گڑیوں کو نئے لباس پہناتی۔ پھر دونوں مل کر ان کا گھر سجاتے' بسکٹ اور ٹافیاں برتنوں میں ڈال کر ان کے لیے کھانا بناتے۔ وہ دونوں اتنی محویت سے کھیلتے کہ گرد و پیش کا ہوش ہی نہ رہتا۔ لگتا اپنی الگ سے دنیا بسالی ہے۔

عمو کی بڑی بہنیں اکثر اسے ڈانٹا کرتیں۔ ''اے تم لڑکی ہو جو گڑیوں سے کھیلتے ہو' اپنی عمر دیکھو' قد کاٹھ دیکھو اور یہ کھیل دیکھو۔ بچی کے ساتھ تم بھی بالکل بچہ ہی بن جاتے ہو۔ کچھ عقل کیا کرو۔''

عمو شرمندہ ہو کر کھیل چھوڑ دیتا۔ لیکن وہاں سے جا نہیں پاتا۔ شبی اپنی پیاری پیاری آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی۔ ''میرے ساتھ

کھیلو گے نہیں؟''

تو وہ آنسوؤں سے مرعوب ہو کر پھر بیٹھ جاتا' کھیلتا رہتا' جب تک شبی چاہتی۔ اس کے دل سے بہنوں کی ڈانٹ کا خوف بالکل نکل جاتا۔

کبھی کبھی شبی فرمائش کرتی۔

''عمو میرے لیے چڑیا کے گھونسلے سے بچے نکال لاؤ۔'' عمو سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہ کرتا کہ بچے نکال لانا بری بات ہے۔ وہ جھٹ سے چڑیا کے گھونسلے تک پہنچتا اور ہاتھ بڑھا کر بے بال و پر بچے نکال لاتا۔ چڑیا چڑا تڑپ تڑپ کر چوں چوں کرتے رہتے۔ لیکن ان کی تڑپ کا اسے احساس ہی نہ ہوتا۔ اسے تو شبی کی خوشی پوری کرنا ہوتی تھی۔

ایک بار اس کی امی نے بچے یوں نکالنے پر اسے ٹوکا۔ ''بیٹے' یہ بڑا ظلم ہے' چڑیا بددعائیں دے گی۔ مت نکالا کرو اس کے بچے۔'' لیکن وہ تو یہ کھیل تب ہی ختم کر سکتا تھا' جب شبی منع کرتی۔

''میرے لیے جامن توڑ لاؤ۔'' وہ عمو سے کہتی تو وہ بندروں کی طرح جھٹ سے درخت پر چڑھ کر کچے پکے جامن توڑنے لگتا۔ وہ کئی بار درختوں سے گرا بھی تھا' کپڑے تو کئی بار پھٹے تھے' ڈانٹ اور مار پڑتی تھی' لیکن شبی کی فرمائش پوری ہوتی تھی۔

ایک بار شبی نے کہا۔ ''مجھے بھی درخت پر چڑھاؤ۔''

''درخت سے کہیں گر نہ جانا۔'' عمو ڈر گیا۔

''کیا ہو گیا' تم بھی تو چڑھتے ہو' گرتے ہو۔'' شبی رسانیت سے بولی۔

''میری اور بات ہے' تمہیں کہیں چوٹ نہ آ جائے۔'' وہ اسے چوٹ آنے کے خیال سے ہی پریشان ہو گیا۔

''تمہیں بھی تو چوٹ آ جاتی ہے۔ کیا ہوا جو مجھے آ جائے گی۔'' شبی اصرار کرتے ہوئے بولی۔

وہ اس کی ضد سے عاجز آ کر اسے درخت پر چڑھانے لگا۔ وہ جھک کر کھڑا ہو گیا۔ شبی اس کی جھکی پشت پر چھلانگ لگا کر سوار ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ شبی شاخ پکڑ کر پیر درخت میں جمانے لگی۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ آہستہ آہستہ قدم جماتے وہ اوپر ہی اوپر چڑھتی گئی۔ وہ کمزور شاخوں تک پہنچ گئی۔

''اب واپس آ جاؤ شبی۔۔۔۔۔۔ کہیں شاخیں ٹوٹ نہ جائیں' گر نہ جاؤ کہیں۔'' وہ اسے واپس اترنے کو کہنے لگا۔

شبی سے اب اترا نہیں جا رہا تھا۔ عمو گھبرا گیا۔ خود درخت پر چڑھا اور شبی کو پکڑ کر احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔ لیکن احتیاط کیسی' شبی

کا بوجھ سنبھالنا مشکل گیا۔ پاؤں غلط جگہ پر پڑے اور ابھی وہ زمین سے دس بارہ فٹ اونچائی پر تھے کہ اس کا ہاتھ چھوٹ گیا' پاؤں پھسل گئے اور شبی ایک چیخ کے ساتھ نیچے آ رہی۔ عمو کے لیے اتنی اونچائی سے کودنا آسان نہیں تو مشکل بھی نہ تھا۔ لیکن شبی کو سنبھال نہ پایا۔ شبی کے گھٹنے اور ٹخنے میں چوٹ لگی۔ بڑوں کا غصہ اور عتاب عمو پر ٹوٹا۔ سب نے اسی کو مورد الزام ٹھہرایا۔ ابو نے تو چانٹے بھی لگا دیئے۔

''میں کیا کرتا' شبی ہی کہتی تھی۔'' وہ لعن طعن سن کر منہ بناتے ہوئے بولا۔

''تمہارے بھیجے میں بھوسہ بھرا ہے؟ وہ تو بچی ہے' تم تو سمجھ دار لڑکے ہو' عقل سے کام لیا ہوتا۔''

''شبی ضد کرتی تھی۔''

''اس کی ضد پوری کرنا ضروری تھی' سمجھا سکتے تھے۔''

''سمجھایا تھا' لیکن وہ کہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔''

''وہ کہتی تھی اور تم کر گزرے' کل کو کہے گی چھت سے چھلانگ لگوا دو تو لگوا دینا' کنویں میں کودنے کا کہے تو کود جانا' بے وقوف کہیں کے۔''

ڈانٹ ڈپٹ کا اثر چند دن ہی رہا۔ شبی نے بھی کوئی فرمائش نہیں کی' لیکن اس دن وہ اس کی سائیکل کے پیچھے چڑھ بیٹھی۔

''گھما لاؤ ہمیں۔'' اس نے جیسے آرڈر کیا۔

عمو اسے لے کر نکل گیا۔ لمبی لمبی سڑکیں طے کیں۔ باغ میں چکر لگوائے۔ واپس آ کر بھی لان میں چکر لگواتا رہا۔ وہ تھک گیا تھا' لیکن شبی کو لطف آ رہا تھا۔ اس کی کمر میں مضبوطی سے بانہیں جکڑے وہ سائیکل پر بیٹھی تھی۔

''اور تیز کرو۔۔۔۔۔۔۔ اور تیز'' وہ وقفوں کے بعد کہہ رہی تھی اور عمو اس کے کہنے پر تیزی سے پیڈل پر پاؤں چلاتے لان ہی میں چکر کاٹ رہا تھا۔ چکر کاٹتے شاید چکر آ گیا' سائیکل گری اور دونوں ایک دوسرے پر آن گرے۔ آج بھی چوٹ شبی ہی کو لگی اور ڈانٹ پھٹکار عمو نے سنی۔

لعن طعن سن کر آج بھی عمو نے یہی کہا تھا۔ ''شبی کہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔''

اماں نے اس کا کان مروڑ ڈالا اور غصے سے بولیں۔ ''کل کو شبی کی ہڈی پسلی توڑ دینا' پھر کون سنے گا کہ شبی ہی کہتی تھی۔ میں کہتی ہوں' باز آ جا' بالکل ہی بچہ بنتا جا رہا ہے تو۔۔۔۔۔۔۔ خبردار جو اب تو شبی کے ساتھ کھیلا۔''

لیکن

رکاوٹیں جذبوں کی راہ میں کہاں آسکتی ہیں۔ اسی شام حسب معمول شبی عمو کے پاس تھی اور فرمائش پر پریوں کی کہانی سن رہی تھی۔ من گھڑت سی کہانی جسے عمو اس کی دلچسپی کے لیے جوڑ توڑ رہا تھا' ایکٹنگ کر رہا تھا۔ پری کو قید کرنے والے دیو سے تو وہ سچ مچ خود ہی نبرد آزما تھا۔ کیا کیا گھونسے دکھا رہا تھا' آنکھوں سے غصے سے شعلے نکل رہے تھے' دانت پیس پیس کر دیو کی ہڈی پسلی توڑنے کی باتیں کر رہا تھا۔ اور شبی مبہوت سی اسے تک رہی تھی۔ سمٹ سمٹ کر اس سے چمٹی جا رہی تھی۔

شب و سحر کا چکر اپنے مخصوص انداز اور مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ شبی اور عمو ایک ان دیکھے بندھن میں جکڑتے چلے گئے۔ اس بندھن کا نام کیا تھا' اس بندھن کا مطلب کیا تھا' شاید دونوں ہی نہیں جانتے تھے۔ لیکن اس بندھن کی گیرائی اور گہرائی کا احساس دونوں ہی کو تھا۔

شبی چند دنوں کے لیے اپنے ماموں کے ہاں کراچی گئی تو عمو کو ساری کوٹھی ویران ویران سی لگنے لگی۔ وہ بوکھلایا پھرتا۔ کھیلنے کو جی چاہتا نہ لکھنے پڑھنے کو۔

شبی نے بھی کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کی۔ کتنا ارمان تھا اسے کراچی جانے کا۔ لیکن دوسرے ہی دن وہ امی سے بولی۔ ''واپس چلیں امی!''

''کیوں؟''

''میرا دل اداس ہو گیا ہے۔''

''ابو کے لیے؟''

''ابو کے لیے بھی۔۔۔۔۔۔۔ عمو کے لیے بھی۔''

سب اس کی صاف گوئی اور بچپن کی سچائی پر ہنس پڑے تھے۔

ایک دفعہ عمو بیمار پڑ گیا۔ کئی دن بخار آتا رہا۔ شبی کو یوں لگتا تھا جیسے بخار عمو کے نہیں اس کے سارے وجود کو تپا رہا ہے۔ جوڑ جوڑ دکھتا محسوس ہوتا۔ عمو کے سرہانے بیٹھی اس کا سر دباتی رہتی۔ وہ سو رہا ہوتا۔ تب بھی نگاہیں اس کے چہرے پر جمائے اس کی ساری تکلیفیں اپنے اندر اترتی محسوس کرتی۔

یہ کیسے جذبے تھے جو سرشار کرتے تھے۔ لیکن جن کے برملا اظہار کی دونوں نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ ایک دوسرے کی

قربت پانے کی تمنا ہمیشہ کی تھی۔لیکن اس کا اظہار الفاظ میں کبھی بھی نہیں کیا تھا۔

وقت کا چکر چلتا رہا۔

پانچ چھ سال بیت گئے۔اب عمو سمجھدار تھا۔ناسمجھ شبی بھی نہیں رہی تھی۔آپوں آپ اس نے بہت کچھ محسوس کرنا سیکھ لیا تھا۔

انہی دنوں خالہ خالو نے اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونا تھا۔اب ان کے کپڑے کی فیکٹری بہت بڑی ہوگئی تھی۔دونوں بیٹیوں کی شادیاں بھی ہوگئی تھیں۔بڑا بیٹا لندن اعلیٰ تعلیم کے لیے چلا گیا تھا اور برسوں پہلے خریدی ہوئی زمین پر شاندار کوٹھی بھی تعمیر ہو چکی تھی۔

سب کو وہاں جانے کی خوشی تھی۔

ایک عمو تھا' جو اس گھر سے جانا نہیں چاہتا تھا۔شبی نے اس دن کہہ ہی دیا۔''تم بھی چلے جاؤ گے عمو؟''

عمو اس بات سے پریشان ہو گیا تھا۔آہستگی سے بولا۔''میں کب جانا چاہتا ہوں شبی' لیکن امی ابو گئے تو مجھے بھی لے جائیں گے۔''

''تم نہ جانا عمو۔۔۔۔۔۔۔''شبی کے اندر خلا سا پھیلنے لگا۔

عمو نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔اتنے غور سے کہ شبی کی جھلملاتی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔آج پہلی بار اس کا جی چاہا کہ اس پیاری سی ہمیشہ اپنی محسوس ہونے والی لڑکی کو بازوؤں میں بھرے اور سینے میں چھپا لے۔چاہت کا یہ انداز اس نے اپنے سینے میں پہلی بار ہلچل مچاتے محسوس کیا تھا۔وہ سرشار سرشار سا اسے تکنے لگا۔

جذبے جذبوں کی زبان سمجھتے ہیں۔خاموشی بولنے لگتی ہے۔اور ان کہی باتیں کہے بنا سمجھ میں آجاتی ہیں عمو کے جذبات کی ہلچل شبی کو بڑے راز کی باتیں سمجھا گئی۔اسے بھی اپنے من میں شوریدہ سر لہروں کے اٹھنے کا احساس ہوا۔اس کا جی چاہا کہ عمو کے سینے کی گہرائیوں میں اتر جائے۔لیکن شریف گھرانے کی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی جذبات کو مستور رکھنا از خود سیکھ لیا تھا۔شرم وحیا کی لالی اس کے چہرے پر بکھر گئی۔اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

پھڑپھڑاتے لبوں کی مسکراہٹیں دانتوں تلے دبا لینے کی کوشش کی۔

دونوں مسحور سے ہو گئے۔زندگی کے یہ خوبصورت رویے ان کی چاہتوں کو نیا رنگ دے گئے۔

عمو نئے گھر میں چلا تو گیا۔لیکن حیات کا مرکز یہیں تھا۔وہ دن میں ایک بار تو ضرور ہی یہاں آتا۔شبی آنکھوں میں انتظار کی شمع جلائے اس کی راہ تکا کرتی۔وہ ذرا بھی دیر میں آتا تو وہ بے چین ہو جاتی لیکن ہمیشہ ہی اس نے اپنی بے چینیاں نہاں خانہ دل میں

مستور رکھیں۔ ہاں عمو اب اپنی کیفیتوں کا برملا اظہار کرنے لگا تھا۔

''شبی! تم نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔''

''تمہارے بغیر تو میں زندہ نہیں رہ سکتا۔''

''تم میری زندگی ہو۔''

''ہم دونوں ایک ہیں۔''

''میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم میری زندگی پر اس طرح چھا جاؤ گی۔ بے بس کر کے رکھ دو گی۔''

وہ جب بھی ملتا اپنے جذبوں کا اظہار ضرور کرتا۔ شبی مسکرا کر بار حیا سے نظریں جھکا کر اس کی باتوں کی خاموش تائید کرتی۔ اس کے جذبے شاید عمو سے بھی زیادہ تنومند تھے۔ لیکن وہ بے باک نہیں تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تو اس کی زبان گنگ ہوتی جا رہی تھی۔

''کبھی تو کچھ کہا کرو۔''

''کبھی تو میری محبت کا اعتراف کیا کرو۔''

''کبھی تو دل کی باتوں کو زبان دیا کرو۔''

عمو اکثر کہتا۔ لیکن اس کی مسکراہٹیں ہی بکھر کر احساس دلا دیتیں۔ زبان سے کچھ کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اسے تو کچھ کہنے کے خیال ہی سے جھرجھری آ جاتی اپنے آپ میں سمٹ جاتی۔ بن کہے ہی چہرہ تپنے لگتا اور کانوں کی لوویں سرخ ہو جاتیں۔

ویسے وہ دونوں بے تکلف تھے۔ محبت کے موضوع سے ہٹ کر شبی خوب ہی باتیں کرتی تھی۔ اپنے کالج کی باتیں' اپنی سہیلیوں کی باتیں' اپنی پسند کی باتیں' وہ بے دھڑک کیا کرتی تھی۔ دونوں پہروں اب بھی اکٹھے بیٹھے رہتے۔ لان میں چہل قدمی کرتے۔ ڈرائیو کے لیے چلے جاتے۔ ان پر کوئی پابندی تھوڑا ہی تھی۔ دونوں کے والدین تو خوش تھے۔ اکثر سر جوڑ کر بیٹھتے اور انہیں ایک بندھن میں جوڑ دینے کے خوش کن منصوبے بناتے۔

شبی نے ایف اے کر لیا تو خالہ باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں۔

''شبی میری بیٹی ہے۔'' انہوں نے اسے لپٹا لیا۔

''آپ ہی کی ہے۔'' شبی کے ابو نے کوئی تکلف نہیں کیا۔

بات طے ہی تھی۔ منگنی کر کے صرف اعلان ہی کرنا باقی تھا۔

خالہ نے اس کے ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن ڈال دیئے۔ یہ تمہارے پاس ہونے کے ہیں۔ شبی خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

اس شام عمو نے اسے خوبصورت سی گھڑی انعام کے طور پر دی تھی۔ گھڑی دکھاتے ہوئے وہ بولا۔ ''بارگاہ حسن میں عمو کا پہلا تحفہ''

وہ سرخ ہوگئی۔ ''عمو۔۔۔۔۔۔۔!'' اس نے تنبیہی لہجے میں مسکرا کر کہا۔

عمو مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اجازت ہو تو گھڑی پہنا دوں؟''

شبی شرما گئی۔ ہاتھ بڑھا کر گھڑی لینا چاہی تو وہ بضد تھا۔ ''میں خود تمہاری کلائی پر باندھوں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟'' وہ برہم سا ہوگیا۔

''بس''

''میں پہناؤں گا۔''

''میں خود پہنوں گی۔''

عمو چند لمحے اسے تکتا رہا پھر قدرے جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''کیا میں تمہیں چھو نہیں سکتا؟''

''نہیں'' وہ قدرے پرے سرک کر بولی۔

عمو نے اسے گھورا۔ پھر شوخی سے بولا۔ ''جانتی ہو گھر والوں کے کیا ارادے ہیں؟''

''کیا۔۔۔۔۔۔۔؟''

''ہم دونوں کو ایک کرنے کا فیصلہ انہوں نے کرلیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ جانتی ہو نا؟''

وہ شرما گئی۔

''جانتی ہو نا؟''

اس نے شرمیلے انداز سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

عمو پھر بولا۔ ''اور یہ جانتے ہوئے بھی' اجازت نہیں کہ میں تمہاری کلائی چھولوں۔''

''ہاں''

''کیوں؟''

وہ مسکرائی' پھر لجائے ہوئے ہولے سے بولی۔ ''ابھی نہیں۔''

''پھر کب؟''

''بعد۔۔۔۔۔۔۔''

''شادی کے بعد؟''

وہ مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا کر بھاگ گئی۔

عمو شبی کی قربت میں کبھی کبھی بے حد جذباتی ہو جاتا۔ محبت کا بھرپور اور پر جوش اظہار کرنے کی طلب ہوتی۔ لیکن شبی نے ایک فاصلہ اپنے اور اس کے درمیان کر رکھا تھا۔ اس کے آگے خود بڑھتی نہ اسے بڑھنے کی جرات دلاتی۔ اب وہ سمجھ دار تھی۔ شرافت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ شریف اور سمجھ دار لڑکیاں اپنی عفت و پاکیزگی کے سرہانے سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتی ہیں۔ شبی بھی ایسی ہی لڑکیوں میں سے تھی۔

عمو بھی جانتا تھا' حد سے آگے بڑھنے کی اس نے بھی کبھی جرات نہ کی تھی لیکن کبھی کبھی جب اس کے جذبات بے حد جوشیلے ہوتے اور شبی فاصلے کی چٹان درمیان میں لے آتی تو وہ برہم سا ہو جاتا۔ ناراض ہوتا' منہ پھلا لیتا بدمزگی سی پیدا ہو جاتی۔

انہی دنوں عمو کو ٹریننگ کے لیے باہر جانا پڑا۔ ابو کی فیکٹری اب ٹیکسٹائل مل بن گئی تھی۔ عمو کو ٹیکسٹائل کی ٹریننگ کے لیے باہر بھیجنا ضروری تھا۔ اتنے بڑے کاروبار کو اب ابو اکیلے نہیں سنبھال سکتے تھے۔ وہ اس مل کو نئے انداز میں چلانا چاہتے تھے۔ یہ ٹریننگ عمو کو اسی لیے ضروری دلانا تھی۔ دو سال کے لیے اسے باہر جانا تھا۔ باہر جانے کی لگن بھی تھی خوشی بھی' لیکن یہ طویل عرصہ مرکز حیات سے دور رہ کر گزارنا بھی قیامت لگ رہا تھا۔

شبی بھی بچھڑنے کے خیال سے مضطرب تھی۔ وہ تو اس سے ایک دن بھی دور نہ رہ سکتی تھی۔ دو سال کا عرصہ تو بہت لمبا تھا۔ لیکن عمو کے مستقبل کی کامیابی کی ضمانت تھا یہ عرصہ' روتے دھوتے گزارنا ہی تھا۔

اس رات جب وہ اسے خدا حافظ کہنے آیا تو وہ اپنے کمرے میں تھی' آنکھیں متورم تھیں' چہرہ بھیگا بھیگا تھا۔

''شبی'' عمو کی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی۔

وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

''میں تمہیں خط لکھوں گا۔۔۔۔۔۔۔ جواب دو گی نا؟''

سر ہلاتے ہوئے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر پیازی گالوں پر لڑھک گئے۔

''شبی!'' عمو بے اختیارانہ بے تابی سے بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھا۔ وہ اس جان جاں اور جان تمنا کو آج تو بازوؤں میں بھر کر سینے میں سمو لینے کی جرات کر سکتا تھا۔

لیکن

شبی پیچھے ہٹ گئی۔

عمو کے پھیلے ہاتھ ٹوٹی شاخوں کی طرح گر گئے۔

''میں دو سال کے لیے جا رہا ہوں شبی'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔

''جاؤ' خدا تمہیں کامیاب کرے۔'' وہ ہولے سے بولی اور اس کی طرف پشت کر لی۔

آنسو مستور رکھنا تھے نا۔۔۔۔۔۔۔ چند لمحے عمو کھڑا رہا۔ ایک لمحہ کو جھلایا بھی' برہم بھی ہوا' آج بھی فاصلے کی چٹان راہ میں شبی نے کھڑی کر دی تھی۔ پھر آہستگی سے بولا۔ ''میں جا رہا ہوں شبی' خدا حافظ''

''خدا حافظ'' وہ ایک دم پلٹی۔ عمو دروازے سے نکل رہا تھا۔ اس نے بھی پلٹ کر دیکھا' رکنا چاہا۔ لیکن بڑی بہن نے آواز دے کر بلا لیا۔

ہجر و فراق کے دو لمحے گزارنا مشکل ہوتے ہیں۔ دو سال تو بڑا طویل عرصہ تھا' لیکن وقت گزر جاتا ہے۔ یہی تو اچھی عادت ہے وقت کی' برا ہو یا اچھا' گزرتا چلا جاتا ہے۔ دو سال بیت ہی گئے۔

عمو واپس آ گیا۔ شبی کو یوں لگا جیسے زندگی کی روٹھی بہاریں لوٹ آئی ہیں۔ یہی حال عمو کا بھی تھا۔ لمحہ لمحہ گن کر گزارتا رہا تھا۔ جذبات کو ہر آنچ سے بچا بچا کر سینت سینت کر رکھتا رہا تھا۔ جذباتی آسودگی کوئی مشکل مرحلہ نہ تھی۔ لیکن عمو کو تو اپنا تن من شبی کی امانت لگتا تھا۔ وہ اس امانت میں خیانت نہیں کر سکتا تھا۔ بڑے موقعے آئے۔ لیکن وہ دامن بچا کر نکل گیا۔

ہاں جب وہ شبی سے ملا تو ضرور بے باکانہ بے تکلفی سے ملنا چاہا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

لیکن

شبی زد میں آنے سے پہلے ہی ایک طرف سرک گئی۔ ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی جھلایا' برہم سا نظر آیا۔

شبی گوشہ چشم سے اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ آج تو اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

عمو نے اسے گھورا۔

''کیسے ہو عمو۔۔۔۔۔۔۔سفر بخیریت کٹ گیا؟''شبی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کٹ گیا۔''اس نے برا سا منہ بنایا۔

''بیٹھو گے نہیں؟''اس نے بیڈ کے کنارے بیٹھتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''بیٹھ کے کیا کروں گا؟''وہ ناراض ناراض سا نظر آیا۔

شبی مسکرانے لگی۔پھر آہستگی سے بولی۔''باتیں کریں گے' دو سال کی روداد سناؤ گے نہیں؟''

شبی نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔وہ اس کے کہنے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بہت خراب ہو تم۔''اس نے شاکی انداز میں کہا۔

''کیوں؟''شبی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔

''اتنی مدت بعد آیا ہوں۔''

''خاصی طویل اور تکلیف دہ تھی یہ مدت''

''شکر ہے اس کا تو تمہیں احساس ہے۔''

''احساس ہے اور بہت ہے عمو' تم آ گئے ہو۔بتا نہیں سکتی کہ کتنی خوشی ہو رہی ہے۔''

''محترمہ کبھی کبھی خوشی کا اظہار کرنا بھی سیکھ لو۔''وہ شوخی سے بولا۔

''ابھی نہیں۔''وہ حیا بار نظروں سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''شبی۔۔۔۔۔۔۔!''وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

''ہوں''وہ اس کو دیکھنے لگی۔

''مجھے تو تمہاری اس ''ابھی نہیں'' سے ڈر لگنے لگا ہے۔''وہ بولا۔

مسکرا کر اس نے پوچھا۔''کیوں؟''

''یہ ابھی نہیں' کبھی نہیں نہ بن جائے۔''وہ شاکی تھا۔

وہ اس کی بات پر ہنس پڑی۔

''یہی لگتا ہے مجھے'' وہ پیار سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ شبی نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کی اس محجوب ادا نے عمو کے جواں سینے میں ہلچل سی مچا دی۔ لیکن وہ کرسی میں ہی پڑا رہا۔

عمو کیا آیا تھا' بہاریں لوٹ آئی تھیں۔ صبح و شام کی گردشیں حسین ہو گئی تھیں۔ زندگی جو ٹھہرے ہوئے ساکن پانی کی جھیل تھی۔ اب ناچتی گاتی اچھلتی کودتی ندی کی طرح لگنے لگی تھی۔

شبی اور عمو اب بھی روز ہی ملتے تھے۔ کبھی وہ خالہ کے ہاں چلی جاتی۔ کبھی عمو آ جاتا۔ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے' پہروں اکٹھے رہتے' کبھی لان میں چہل قدمی کرتے' کبھی ڈرائیو کے لیے چلے جاتے۔

اس دن دونوں گاڑی میں بیٹھے سڑکوں کی لمبائیاں ماپ رہے تھے۔ عمو نے نئی گاڑی خریدی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ گنگناتے ہوئے وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ کبھی کبھی شوخ سا مصرعہ ترنم سے ادا کرتے ہوئے وہ شبی کی طرف دیکھ لیتا۔ شبی لجا جاتی' عمو بے حد محظوظ ہوتا۔

اس طرح اک شوخ سا شعر کہتے ہوئے وہ شبی کی طرف اتنا جھک آیا کہ اس کی گرم سانسیں شبی کے رخساروں کو چھو گئیں۔

شبی ایک دم سرک کر کھڑکی کی طرف ہوتے ہوئے ناراضگی سے اسے تکنے لگی۔

''اوہ سوری۔۔۔۔۔۔۔ فاصلے کی چٹان کا احساس نہ رہا۔'' وہ لہکتے ہوئے بولا۔

شبی اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک سے گاڑی چلاؤ' لگتا ہے نشے میں ہو نئی گاڑی کا۔''

''نہیں شبی' نئی گاڑی کا نشہ نہیں ہے۔''

''تو پھر کس کا ہے؟''

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے بولا۔ ''ابھی نہیں کا۔''

شبی نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

عمو اسے تکتے ہوئے بولا۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''ہوں''

''تم اتنی سخت کیوں ہو' ظالمانہ حد تک سخت۔۔۔۔۔۔۔ لڑکیاں ایسی تو نہیں ہوتیں۔''

شبی نے تراشیدہ بال جھٹکے سے ہٹائے اور بڑے مستحکم لہجے میں بولی۔ ''اپنے اپنے اصول ہوتے ہیں عمو''

''بے رحم اور سنگدلانہ'' وہ شوخی سے بولا۔

''تم ایسا سمجھتے ہوں گے۔'' وہ بالکل سنجیدہ تھی۔

''ظاہر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

شبی نے اس پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی۔ وہ خاموش تھا' لیکن برہم نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور گردن گھما کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ عمو کی باتوں کا مزاج اور رویہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ عام نوجوانوں کی طرح وہ بھی اپنی دوست محبوبہ اور منگیتر سے بے تکلفی کی ساری حدیں پھلانگ کر ملنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس بے باکی سے متنفر تھی۔ وہ دونوں جب تک الگ الگ تھے انہیں مذہب اور معاشرے کی متعین کردہ حدود کے اندر ہی رہنا چاہیے تھا۔ اس بات پر وہ سختی سے پابند تھی۔ اسے عمو پر بھی ناز تھا کہ وہ اس کی سختی پر کڑھنے کے باوجود اس کے قائم کردہ فاصلوں کا پاس رکھتا تھا۔ تنہائیوں اور قربتوں نے اس کے جذبات کو اتھل پتھل بے شک کیا تھا' لیکن اس نے کبھی شبی کو چھونے تک کی بھی جسارت نہیں کی تھی۔ کتنا مان' کتنا بھروسہ اور کتنا اعتماد تھا اسے اپنے عمو پر۔ جب بھی وہ سوچتی خوشی و مسرت کی لہریں اپنے من میں اٹھتی محسوس کرتی' تفاخر کا احساس ہوتا۔

عمو کے والدین کا ارادہ تھا کہ اگلے سال شادی کر دیں۔ لیکن عمو اب فاصلے سمیٹنا چاہتا تھا۔ دوریاں ختم کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس لیے اس نے امی سے کہہ ہی دیا۔

امی ہنس پڑیں۔ ''خالہ خالو سے پوچھ لے' وہ کرنے پر آمادہ ہیں تو ہمیں کیا اعتراض؟''

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے امی' آپ ان سے مل کر تاریخ مقرر کر دیں۔''

''تیاری بھی تو کرنا ہوتی ہے' ایک سال اور گزر جاتا تو۔۔۔۔۔۔۔''

''نہیں امی۔۔۔۔۔۔۔ ایک مہینہ بھی نہیں۔''

''اوہو۔۔۔۔۔۔۔''

''بس امی! اب آپ جلد از جلد میری شادی خانہ آبادی کر دیں۔'' اس نے امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر انہیں پیار سے جھنجھوڑ ڈالا۔

بیٹے نے خود کہہ دیا تھا' اس لیے کاروباری مفاد کے لیے شادی کو التوا میں ڈالنا ٹھیک نہ تھا۔ دونوں خاندانوں میں صلاح مشورے ہوئے اور شادی کا فیصلہ کر لیا گیا۔ شادی کی تیاریوں میں شبی بھی شریک ہو گئی۔ اپنی پسند کی چیزیں خریدنا اور بنوانا تھیں۔

روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ انہیں تو ارمان نکالنا تھے۔ شبی جس شے کا نام لیتی، جس چیز کی طرف اشارہ کرتی وہ خرید کر حاضر کر دی جاتی۔ خالہ بھی اس کی پسند سے کپڑا اور زیور خرید رہی تھیں۔ یوں شبی پر دوہرے کام کی ذمہ داری آن پڑی۔ سارا سارا دن مصروف گزرنے لگا۔ کبھی بازاروں کے چکر، کبھی پنڈی کا دورہ۔۔۔۔۔۔۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور اچھی سے اچھی چیزیں خریدی جا رہی تھیں۔ سارا کام کرتے اسے بالکل تھکن محسوس نہ ہوتی۔ ہر چیز سے تصور کی انوکھی دنیا وابستہ تھی۔ عمو کی اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہو رہی تھی۔ یہ بات بڑی کیف آگیں تھی۔

عمو اب بھی روز ہی آتا تھا۔ اکثر شبی کی امی ہنس کر ٹوکتیں۔

''بھئی عمو اب تو نہ آیا کرو۔''

''کیوں خالہ؟''

''کچھ دن تو پردہ کرنے دو شبی کو۔''

''اوہ خالہ۔۔۔۔۔۔ آپ بھی کتنی دقیانوسی باتیں کرتی ہیں۔''

خالہ ہنس کر کہتیں۔ ''کچھ دقیانوسی باتیں بڑے فائدے کی ہوتی ہیں۔''

''اوں ہوں۔۔۔۔۔۔'' وہ بھی اسے آہستگی سے کہتی۔ ''عمو اب تو نہ آیا کرو۔''

''کیوں؟''

''بس''

''بس کیا ہوا؟''

''بس مجھے شرم آتی ہے تم سے۔''

شبی نے بڑے خوبصورت انداز سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

عمو کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس معصوم ادا پر وہ اپنے من میں بے چین سی ہلچل محسوس کرنے لگا۔ وہ ایک دم کمرے سے باہر نکل آیا۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بھی تحریک دے دیتی ہیں، جذبات کو ایکا ایکی بھڑکانے کی، کوئی کمزور سا لمحہ بھی تو آجاتا ہے۔

اور

اس دن بھی شاید کوئی ایسا ہی لمحہ تسلسل کی زنجیر سے تحریک پا کر الگ ہو گیا تھا۔

شبی درزی سے سلے ہوئے کچھ کپڑے لے کر آئی تھی۔ امی ابو دوپہر کے کھانے کے بعد پنڈی شاپنگ کے لیے چلے گئے تھے۔

کپڑے اپنے کمرے میں لا کر بیڈ پر رکھ دیئے۔ قمیضوں کی فٹنگ دیکھنا تھی۔ اس نے ساری قمیضیں الگ کر کے رکھیں۔

قمیضوں پر خوبصورت کامدانی موتیوں گوٹے اور کڑھائی کے کام کئے ہوئے تھے۔ وہ ایک قمیض دیکھ رہی تھی۔ تصور میں وہ ان چھوئے لمحے لہرا رہے تھے' جن کے لیے یہ خوبصورت لباس تیار ہو رہے تھے۔

شبی کی آنکھیں مسرتوں کی روشنی بھری تھی۔ وہ اس وقت بڑی مسرور تھی۔ بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ٹیپ آن کر دیا۔ اس کی دل پسند دھن ہولے ہولے فضا کو مترنم کرنے لگی۔ دھن کے ساتھ ساتھ اس کے لبوں میں بھی ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ اور وہ بڑے مسحور اور مخمور لہجے میں ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی۔

شبی نے ستاروں بھرے کرتے کو اٹھایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ساتھ لگا کر دیکھا۔ بہت خوبصورت تھا۔ اسے پہن کر دیکھنا تھا۔ شبی نے ایک ہاتھ میں کرتا پکڑا اور دوسرے سے اپنی پہنی ہوئی قمیص کی زپ آدھی کھولی تھی کہ چھٹ سے پلٹی' دروازہ بند کر کے کپڑا بدلنا تھے۔

لیکن

وہ مڑتے ہی ششدر سی رہ گئی۔

عمو کرسی کی پشت پر ایک ہاتھ رکھے کھڑا اسے ہی تک رہا تھا۔

شبی کے اوسان خطا ہو گئے۔ سینے اور ہونٹوں میں آگ کی جلن اتر رہی تھی۔ اس نے بہت جدوجہد کی لیکن عمو سے چھٹکارا نہ پا سکی۔ اس کا تو ذہن ہی ماؤف ہو رہا تھا۔ اسے عمو کے پیکر میں کوئی شیطان اترا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن چیخیں حلق ہی میں گھٹ گئیں۔ سارا جسم مفلوج سا ہو گیا۔ مزاحمت کی بھی ہمت نہ رہی۔

عمو پر جذبات کا بھوت سوار تھا۔ اس نے قائم کردہ حدیں توڑ دی تھیں۔ فاصلے مٹا دیئے تھے۔ شاید اس کی دست درازیاں اور بھی دراز ہو جاتیں۔ لیکن شبی اس کے بازوؤں میں کسی سیال سی شے کی طرح بہنے لگی تھی۔ اس کے وجود کو سہارنا مشکل ہو رہا تھا۔

''شبی۔۔۔۔۔۔۔!'' عمو کو جیسے ایک دم ہی ہوش آ گیا۔ جذبات کے تیز و تند ریلے سست پڑ گئے۔ اس نے شبی کو پکارا۔ لیکن وہ گری جا رہی تھی۔

عمو نے جلدی سے اسے بیڈ پر ڈال دیا۔

اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس پر شرمندگی اور گھبراہٹ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہ اس نے کیا کیا تھا۔ اسے ایسا کرنے کی جرات کیونکر ہوئی۔ وہ خود سے سوال کرتے ہوئے شبی کو کندھے سے ہلا ہلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''شبی مجھے معاف کر دو' مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں بہت شرمندہ ہوں' مجھے معاف کر دو ۔۔۔۔۔۔۔ پلیز شبی ۔۔۔۔۔۔۔ پلیز ۔۔۔۔۔۔۔''

وہ معذرتانہ بے اختیار سے شبی کو پکار رہا تھا۔

شبی کئی لمحے بیدم سے نڈھال سی بستر میں پڑی رہی۔ اور وہ مارے گھبراہٹ کے کبھی اس کے پاؤں پکڑ کر ہلاتے ہوئے معافی کی درخواست کرتا' کبھی کمرے میں مجنونانہ انداز میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے ہاتھ ملتا۔

شبی نے کئی بے بضاعت لمحوں کے گزرنے کے بعد آنکھیں کھول دیں۔

عمو کو دیکھا۔

سانحے کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔

عمو ندامت سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے معافی مانگنے کو ہاتھ اٹھائے تو شبی حواس باختہ سی ہو کر چیخی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی چیخ کو بے آواز کر دیا۔

''شبی ۔۔۔۔۔۔۔ پلیز شبی ۔۔۔۔۔۔۔ دیکھو' مجھ سے انجانے میں غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ کچھ نہیں ہوا۔ کوئی بات نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہماری شادی تین ہفتے بعد ہونے ہی والی ہے نا ۔۔۔۔۔۔۔ پھر بھی میں تم سے معافی مانگتا ہوں' مجھے معاف کر دو۔''

وہ سر جھکائے بار بار ہاتھ باندھ رہا تھا' معافی مانگ رہا تھا' گڑگڑا رہا تھا۔

شبی حواس میں آئی۔ بیڈ سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہونٹ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید تھے۔ آنکھیں کرب و اذیت سے بھری تھیں۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جذبات کی وحشت عمو پر اس طرح سوار ہو جائے گی۔ کوئی لمحاتی کمزوری اسے اس طرح گرفت میں لے لی گی۔ کتنا مان تھا' کتنا بھروسہ اور کتنا اعتماد تھا اس پر۔ عمو اتنے پست کردار کا بھی مظاہرہ کر سکتا تھا۔ جذبوں کو اتنا سرکش اور بے باک بھی بنا سکتا تھا۔ برق کی سی تیزی سے یہ خیال شبی کے ذہن میں آ رہے تھے۔

اور

جب عمو نے جھک کر اس کے پاؤں کو چھو کر کہا۔ ''شبی! میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں' پلیز اس بات سے کوئی اثر نہ لینا' نادم ہوں' پتہ نہیں مجھے آج کیا ہو گیا تھا۔ پھر بھی کوئی بات نہیں۔''

شبی اسے خالی خالی نظروں سے تکے گئی۔

وہ خفت سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بات نہیں' ہم تم دو تو نہیں ہیں نا۔۔۔۔۔۔۔ چند دنوں بعد ہماری شادی۔۔۔۔۔۔۔''

لیکن

عمو کی بات ادھوری رہ گئی۔ شبی غصے سے کانپتے ہوئے چلائی۔ ''دفع ہو جاؤ' دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔''

''شبی۔۔۔۔۔۔۔!'' وہ ششدر سا رہ گیا۔

''مت لو میرا نام۔۔۔۔۔۔۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔ چلے جاؤ' دور ہو جاؤ' اپنی منحوس شکل آئندہ مجھے نہ دکھانا کبھی۔''

''شبی'' عمو کا چہرہ فق ہو گیا۔ پھر بھی ہمت کر کے بولا۔ ''میری غلطی ہے' میں معافی مانگ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔۔۔ یہ ایسی۔۔۔۔۔۔۔ بری بات بھی تو نہیں۔۔۔۔۔۔۔ آخر ہماری شادی ہونا ہے۔''

''نہیں ہو گی یہ شادی'' وہ تڑپ کر چلائی۔ ''نہیں کروں گی۔۔۔۔۔۔۔ چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔۔۔۔۔۔۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔''

عمو اس کے اس طرح چلانے اور غصیلے انداز سے ڈر گیا۔ اس وقت وہ اپنے آپ میں نہیں لگتی تھی۔ عمو نے وہاں سے چلے جانا ہی مناسب سمجھا۔ شبی کو اس حرکت سے جو ذہنی دھچکا لگا تھا' اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی ضروری تھا کہ عمو وہاں سے چلا جائے۔

وہ کمرے سے نکل گیا۔ اپنی زیادتی پر ندامت تھی۔ لیکن پھر بھی یقین تھا کہ جب شبی سنبھلے گی تو اس کی یہ جسارت درگزر کر دے گی۔

شبی اس کے جاتے ہی بستر میں گر گئی اور بے اختیار ہو ہو کر رونے لگی۔

تین دن سے متواتر یہی کیفیت تھی۔ کبھی رونے لگتی' کبھی بت سی بن جاتی۔ کبھی سوچوں میں ڈوب جاتی۔

آج امی بھی پوچھ کر پریشان ہو گئیں۔

لیکن

وہ کیا بتاتی' ذہنی دھچکے نے تو اسے بکھیر کے رکھ دیا تھا۔

امی اپنے طور پر قیاس آرائیاں کر رہی تھیں۔ اماں صابراں نے جو تفصیل بتائی تو ان کا خیال پختہ ہو گیا کہ شبی کی عمو ہی سے ان بن ہوئی

ہوگی۔اماں صابراں سے انہوں نے پوچھا۔''کیا عمو آیا تھا کل پرسوں' کسی دن؟''

صابراں نے کہا۔''پرسوں آئے تھے۔بیچارے کتنی دیر دروازے پر کھڑے رہے لیکن بٹیا نے دروازہ ہی نہ کھولا۔کل بھی تھوڑی دیر کے لیے آئے۔بٹیا کل بھی نہیں ملیں۔واپس چلے گئے۔''

اب توامی کو پختہ یقین ہوگیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ پریشان بھی بہت ہوئیں۔ایسی کیا بات ہوئی جو شبی قطع تعلقات کی ان حدود تک پہنچ گئی تھی۔

ان کی پریشانی شبی نے تو دور نہ کی۔اب عمو کا خیال آیا۔اسی سے پوچھ گچھ کر سکتی تھی۔وہ عمو کو فون کرنے کے لیے اٹھیں۔

نمبر ڈائیل کیا۔عمو گھر پر ہی تھا۔

''عمو!''انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد خیر و عافیت دریافت کی۔پھر اسے مخاطب کیا۔

''جی''عمو کی دھیمی آواز آئی۔

''بیٹے!ہم لوگ کل رات واپس آئے ہیں' رات تو سمجھے کہ شبی سو رہی ہوگی۔اس کو بلایا نہ اس کے پاس گئے۔''

''ہوں''

''لیکن صبح تو میں پریشان ہوگئی۔کیا ہوگیا ہے اسے۔۔۔۔۔۔۔رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔بتاتی نہیں کچھ۔۔۔۔۔۔۔تم آسکتے ہو ابھی؟''

عمو چپ رہا۔

''عمو''انہوں نے خاموشی سے پریشان ہو کر پکارا۔

''جی''عمو کی مریل سی آواز آئی۔

''لگتا ہے تم دونوں میں کوئی جھگڑا ہوگیا ہے اور۔۔۔۔۔۔۔''

''آنٹی۔۔۔۔۔۔۔!''

''کیا ہوا ہے؟''

''جی۔۔۔۔۔۔۔میں کیا بتاؤں۔۔۔۔۔۔۔کچھ بھی تو نہیں ہوا۔آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں آنٹی' خود ہی۔۔۔۔۔۔۔''

''حد ہوگئی۔''وہ جھلا کر بولیں۔''بتاتی شبی بھی نہیں اور تم بھی گول کر گئے۔۔۔۔۔۔۔آخر ہوا کیا؟''

وہ پھر چپ ہو گیا' بتاتا کیا۔

''عمو' وہ اب ترش لہجے میں بولیں۔ ''جانتے ہو' وہ شادی سے انکار کر رہی ہے۔ تم بھی چپ رہے تو۔۔۔۔۔۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔

انہوں نے غصے میں آ کر کہا۔ ''بتاتے کیوں نہیں ہو' کس بات پر لڑائی ہوئی ہے۔''

''بس آنٹی۔۔۔۔۔۔'' وہ مریل سی آواز میں بولا۔ ''پلیز آپ کچھ کریں۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ جھلائیں۔

عمو کی آواز بھرا گئی۔ ڈوبتی آواز بمشکل کہہ سکا۔

''آنٹی آپ کچھ کریں۔ پلیز اسے سمجھائیں۔ وہ۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے فیصلے پر اڑی رہی تو میں۔۔۔۔۔۔ میں آنٹی۔۔۔۔۔۔ ذرا سی غلطی کی اتنی بڑی سزا۔۔۔۔۔۔ آنٹی پلیز آپ کچھ۔۔۔۔۔۔''

''عمو۔۔۔۔۔۔ عمو۔۔۔۔۔۔!'' انہوں نے کئی بار پکارا۔ لیکن عمو کی آواز نہیں آئی۔

ریسیور کریڈل میں پٹخ کر امی نے پیشانی ہتھیلی پر ٹکا دی۔

وہ کچھ بھی تو نہ سمجھ سکیں۔

سمجھ بھی کیسے سکتی تھیں۔

مان' بھروسے اور اعتماد کی موت واقع ہوئی تھی' ان کے لاشے تو تھے نہیں جو وہ دیکھ لیتیں۔

لاشے تو شبی نے دل کے ویران مدفن میں اتار لیے تھے۔

◆◆◆

زہریلا سکون

خرم تین سال بعد وطن واپس آ رہا تھا۔

نازو نے اپنا بہترین لباس پہنا تھا اور اب الماری کے سامنے کھڑی زیور کا انتخاب کر رہی تھی۔ بھاری جڑھاؤ سیٹ' پرل کے کڑے' چوڑیاں' کنگن' ڈائمنڈ کے لاکٹ' ٹاپس' انگوٹھیاں' مخملی ڈبوں میں کیا کچھ نہیں پڑا تھا۔ کچھ زیور تو شادی کا تھا۔ کچھ ان تین سالوں میں جمع ہو گیا تھا۔ آنے جانے والوں کے ہاتھ خرم اسے خوبصورت زیورات اور قیمتی ملبوسات بھیجا کرتا تھا۔

کپڑوں سے میچ کرتا بھاری جڑاؤ سیٹ اس نے نکالا تھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ کانوں میں لمبے لمبے آویزے پہنے۔ پھر وہ گلے میں گلوبند پہن ہی رہی تھی کہ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ ٹانگوں میں بھی سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اسے چند لمحے بے حد کمزوری محسوس ہوئی۔

یہ کیفیت کافی دیر سے تھی۔ لیکن وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کئے جا رہی تھی۔ آج خرم آ رہا تھا۔ وہ اسے ائیر پورٹ پر لینے کے لیے جانا چاہتی تھی۔ دلہنوں کی سی تیاری کر رہی تھی لیکن اب اس کے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے تھے' جسم ٹوٹ رہا تھا۔ دماغ پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔ جسم بے ہمت ہوا جا رہا تھا۔

وہ رات دس بجے گولی کھانے کی عادی تھی۔ آج گیارہ بجے تک بمشکل اپنے آپ کو گھسیٹ پائی تھی۔ اب اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت خراب ہو رہی تھی۔ گرتے ستون کو سہارے کی ضرورت تھی اور یہ سارا نشے کی گولیاں تھیں۔ جنہیں وہ استعمال کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ گلوبند سیٹ پہنے بنا ہی اس نے میز پر رکھ دیا۔ بمشکل وہ اٹھی۔ تھرماس سے پانی گلاس میں انڈیلا اور بیڈ کے گدے تلے چھپا کر رکھی گولیوں کی شیشی نکالی۔ گولی نکال کر اس نے شیشی واپس وہیں رکھ دی۔

وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ دماغ چکرانے لگا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھندسی پھیلنے لگی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں گلاس پکڑا' دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر گولی رکھی۔ ابھی گولی منہ میں رکھ نہ پائی تھی کہ اس کی چھوٹی نند کنول تیار ہو کر اندر آ گئی۔ بھابی کو دیکھے بنا ہی بولی۔ ''تیار ہو گئیں بھابی؟''

پھر اس کی نگاہ آئینے میں نازو کے سراپا پر پڑی' بھابی کو اتنے خوبصورت لباس میں دیکھ کر اسے بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر وہ اس سے لپٹ جانے کو تھی کہ اس کی ہتھیلی پر رکھی گولی دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

''بھابی!'' تقریباً چیختے ہوئے اس نے نازو کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر گولی گراتے ہوئے اسے لپٹا لیا۔

''بھابی' پلیز بھابی! آج تو خرم بھیا آ رہے ہیں' آپ کو انہیں ائیر پورٹ لینے نہیں جانا؟ گولی کھا کر تو آپ بے سدھ ہو کر سو جائیں گی۔''

''کنول۔۔۔۔۔۔۔! مجھے گولی کھا لینے دو' مجھے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ میرا دماغ بوجھل ہوا جا رہا ہے' ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔ آج' آج میں نے صبح بھی کیپسول۔۔۔۔۔۔۔''

''نہیں بھابی' آج آپ کو گولی نہیں کھانے دوں گی۔ چلئے باہر چلئے' ٹھنڈی ہوا سے طبیعت سنبھل جائے گی۔ فلائٹ کے آنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔ انجم تو سکوٹر پر چلا بھی گیا ائیر پورٹ۔۔۔۔۔۔۔ ابا جی بھی تیار ہیں' باجی سنبل بھی آ گئی ہیں' رمل بھی تیار ہے۔ میں تو آپ کو بلانے آئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ چلئے نا!''

نازو نے قدم اٹھایا لیکن اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ کنول نے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن نازو بے سہارا ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے قدم ادھر ادھر پڑ رہے تھے۔ ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔

''بھابی'' کنول نے اسے اس کے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دھبے پھیلنے سکڑنے لگے آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ لہرا گئی۔

''بھابی'' کنول نے بمشکل اسے بیڈ تک گھسیٹا جہاں وہ اوندھے منہ گر گئی۔

کنول چلاتی ہوئی باہر بھاگی۔ دوسرے لمحے ابا جی' سنبل' رمل' سنبل کے تینوں بچے اور گھر کی خادمہ سب ہی بھاگے چلے آئے تھے۔ سنبل نے نازو کو سیدھا کیا۔ رمل نے اس کے پاؤں سے جوتے اتارے۔ ابا جی اس کے چہرے پر جھک کر اسے پکارنے لگے۔

کنول گھبرائی گھبرائی بولی ''بھابی گولی کھانے والی تھیں۔ میں نے نہیں کھانے دی۔''

''کون سی گولی کیسی گولی؟'' سنبل نے نازو کے ہاتھ سہلاتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔

''پتہ نہیں' شاید نیند کی گولی کھاتی ہیں بھابی۔ روز رات کو کھا کر سوتی ہیں۔''

''نیند کی گولی؟'' سنبل نے پھر حیرانی سے کہا۔ ''لیکن آج تو خرم آ رہا ہے۔ آج کیوں کھانا چاہتی تھی نازو نیند کی گولی؟''

''پتہ نہیں'' کنول نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے لاعلمی ظاہر کی۔

رمل بولی ''تجھے کیسے پتہ بھابی نیند کی گولی کھاتی ہیں؟''

''مجھے تو یہی کہتی ہیں۔''

''روز کھاتی ہے؟'' ابا جی پہلی دفعہ بولے۔

''ہاں ابا جی۔۔۔۔۔۔۔روز رات کو سونے سے پہلے کھاتی ہیں۔''

ابا جی نے سر ہلایا سنبل نے سوالیہ نگاہوں سے باپ کو دیکھا ان کی جگہ رمل بولی۔ ''گولیاں تو بھابی ایک مدت سے کھاتی ہیں۔''

''کیوں؟'' سنبل نے پوچھا۔

ابا جی بولے۔ ''تمہیں یاد تو ہے۔ تمہاری اماں کے مرنے کے بعد نازو بیمار ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے ہی دماغی سکون کے لیے گولیاں دی تھیں۔ شاید ویلیم۔''

''لیکن ابا جی اس بات کو تو تین سال ہونے کو آئے جب سے اب تک نازو یہ گولیاں کھاتی چلی آرہی ہے؟''

''مجھے تو پتہ نہیں۔ یہ کنول ہی اس کے پاس ہوتی ہے رات کو۔۔۔۔۔۔۔یہی بتا رہی ہے؟''

''حد ہوگئی'' سنبل بولی۔

کنول بولی۔ ''بھابی کہتی ہیں کہ وہ گولی نہ کھائیں تو مر جائیں۔۔۔۔۔۔۔صبح کیپسول بھی کھاتی ہیں۔''

سنبل پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کبھی نازو کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی کمرے میں موجود افراد کو۔ وہ کراچی میں رہتی تھی۔ پورے ڈیڑھ برس بعد سسرال سے آج ہی یہاں آئی تھی۔ اس کا بھائی طویل عرصے کے بعد آرہا تھا نا.....

نازو کو اس نے دیکھا۔ اسے اس کی آنکھوں میں دھند اور غبار سا پھیلا محسوس ہوا تھا۔ یہ بھی لگا تھا جیسے وہ حواس میں پوری طرح نہیں۔ یہ بالکل غیر محسوس سی بات تھی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ نازو آج خرم کے آنے کی وجہ سے اس طرح دکھائی دے رہی ہے۔ تین سال کے طویل عرصے کے بعد وہ آرہا تھا۔ دل و دماغ کا خوشی سے بہک بہک جانا غیر فطری بات تو نہ تھی۔

نازو کی حالت کے پیش نظر سنبل نے ڈاکٹر کو بلانا ضروری سمجھا۔ وہ نہ تو بیہوش تھی نہ ہی ہوش میں تھی۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں بے جان سے تھے۔ کبھی کبھی جسم میں لرزنے کی سی کیفیت بھی پیدا ہو رہی تھی۔ آنکھیں کھول کر سب کو دیکھتی بھی تھی۔ لیکن بولنے کی جیسے سکت نہ تھی۔

ادھر ایئر پورٹ جانے کی جلدی تھی ادھر نازو کی یہ حالت۔۔۔۔۔۔۔گھر میں یہ عجیب سی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ خرم کے آنے کی خوشی سب سے زیادہ نازو ہی کو تھی وہی یوں پڑ گئی تھی۔ شاید زیادہ خوشی کا بار سنبھال نہ پائی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے جو خدشہ ظاہر کیا اس نے سب

کے ہوش اڑا دیئے۔

اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ نازو منشیات کی عادی ہے اور وقت پر نشہ نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہے۔ اس نے وہ گولی دیکھی جو کنول نے نازو کی ہتھیلی سے گرائی تھی۔ وہ پھر شیشی مانگی جس میں یہ گولی لی گئی تھی۔ وہ شیشی تو ڈھونڈنے کے باوجود نہ مل سکی ہاں الماری میں کپڑوں تلے رکھی کیپسول کی شیشی مل گئی۔

یہ شیشی ڈاکٹر کے خدشہ کو درست ثابت کر رہی تھی۔

سب کے دماغوں میں جیسے جھکڑ سے چلنے لگے ابا جی نے تو شرم و ندامت سے سر جھکا لیا۔ شریف گھرانے کی بہو کے یہ لچھن ۔۔۔۔۔۔ سنبل، رمل اور کنول بھی نازو کو تیز و تلخ نظروں سے گھور رہے تھے۔ جسے ڈاکٹر نے انجکشن دیا تھا اور ساتھ ہی کہا تھا کہ اس کا مکمل علاج کروایا جائے تاکہ نشے کی عادت چھوٹ سکے دیر کی تو معاملہ سنجیدہ ہو جائے گا۔ کل ہی اسے اسپتال میں داخل کروایا جائے۔

گھر کی فضا ایکا ایکی مکدر ہو گئی تھی۔ خرم کے آنے کی خوشی میں جو قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے اب بوجھل ہو گئے تھے۔۔۔۔۔۔ انجم کے سوا کوئی بھی ائیر پورٹ نہ جا سکا۔ ابا جی اپنی تینوں بیٹیوں میں گھرے اس افتاد پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ نازو سے کسی کو ہمدردی نہیں تھی بلکہ اس کے خلاف نفرت کا احساس جاگ رہا تھا۔ خرم پر کیا بیتے گی یہی سوچ ان سب کو پریشان کر رہی تھی۔ لوگوں کو پتہ چل گیا تو ان کی عزت اور ساکھ کی عمارت دھڑام سے نیچے آن گرے گی۔ رمل کی شادی اسی ماہ طے پائی تھی۔ اس کے سسرال کو پتہ چل گیا۔ تو کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔۔۔۔۔۔ غرض یہ کہ اتنے اندیشے تھے کہ گھر والے سنبھل نہ پا رہے تھے۔

نازو ایک شریف معزز اور خاصے متمول خاندان کی بیٹی تھی۔ چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس لیے لاڈ پیار خوب اٹھائے جاتے تھے۔ دونوں بھائی تو جان چھڑکتے تھے ہی۔ بھابیاں بھی بہت پیار کرتی تھی۔ بڑی آپا کی شادی برسوں پہلے ہو چکی تھی۔ ان کی اولادیں جوان ہو رہی تھیں۔ نازو بڑی آپا کو بھی عزیز تھی لیکن وہ جب بھی میکے آتیں ماں باپ اور بھائیوں بھابیوں کو سمجھاتیں۔ ''آپ لوگ اس کے اتنے ناز نخرے اٹھا کر اچھا نہیں کرتے۔۔۔۔۔۔ جوان ہو گئی ہے کہیں شادی بھی تو کرنا ہے کیا خبر کیسے لوگ ملیں۔۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔۔''

''سب ٹھیک ہو جاتا ہے بڑی آپا۔۔۔'' کوئی نہ کوئی ان کی بات کاٹ دیتا۔ ''لاڈ پیار اس کا حق ہے اور وہ اپنا حق وصول کر رہی ہے۔''

''کچھ زیادہ ہی وصول کر رہی ہے۔۔۔۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے وہ خود سر نہ ہو جائے اب بھی اپنی من مانی کرتی ہے۔ کیا مجال کہ جو بات

کہہ دے وہ پوری نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔جو چیز مانگ لے وہ حاضر نہ ہو۔"

"تو کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔اس نے کبھی ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کی جسے ہم پورا نہ کر سکیں۔"

"ٹھیک ہے' آپ تو پوری کر دیتے ہیں۔کل کو سسرال میں۔۔۔۔۔۔۔"

"اے بڑی آپا۔۔۔۔۔جانے دو۔ہم اپنی بنو کے لیے سسرال ہی ایسا ڈھونڈیں گے جہاں اس کی ہر خواہش پوری ہو۔۔۔۔۔"

بڑی آپا چپ ہو جاتیں۔

ان دنوں نازو بی اے کر رہی تھی۔ پڑھائی سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔بس ہر سال کبھی تھرڈ اور کبھی سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو جایا کرتی تھی۔اسے کونسا نوکری کرنا تھی گریجویشن کرنا تھی بس کہ عام طور پر اچھے رشتوں کے لیے بی اے کی ڈگری ضروری سمجھی جاتی ہے۔

جہیز کا تو مسئلہ نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔امی نے ہی اتنا جہیز جمع کر رکھا تھا کہ دو لڑکیاں بیاہی جا سکتی تھیں پھر ابا کا بینک بیلنس اور زمینیں۔ بھائی کماؤ' بس اچھا رشتہ ملنے کی دیر تھی۔

پڑھائی سے زیادہ اسے ہر جوان لڑکی کی طرح اچھے اچھے جدید طرز کے ملبوسات' نفیس و نازک زیورات اور جدید ترین میک اپ کا شوق تھا۔شکل و صورت بھی خدا نے اچھی دی تھی۔ ہر لباس اس پر خوب سجتا تھا۔

وہ جب بھی کوئی نیا لباس پہنتی تو امی خیر مانگتیں۔ بھائی اور بھابیاں بھی پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہتے۔"اللہ نظر بد سے بچائے۔۔۔۔۔۔۔کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ان کپڑوں میں" تعریف ہر انسان کی فطری کمزوری ہے۔ نازو پھولی نہ سماتی ۔۔۔۔۔۔۔یہ تو اب وہ اپنا حق سمجھنے لگی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ایسے الفاظ اس کے کانوں میں متواتر اترتے رہتے تھے۔ صرف گھر والے ہی نہیں رشتے دار اور سہیلیاں بھی سراہتی تھیں۔

سہیلیاں تو چھیڑا کرتیں۔"تیرا میاں تو پاگل ہی ہو جائے گا۔"

"کیوں؟" وہ اک ادا سے کہتی۔

"مار ڈالے گی بیچارے کو اپنے حسن کے روپ دکھا دکھا کر۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی فخر سے اس کی گردن تن جاتی۔اور وہ خوش دلی سے اپنے متعلق اپنے جیون ساتھی کے متعلق سوچنے لگتی۔وہ خیالوں کی جنت بسائے اپنی ازدواجی زندگی کی بھرپور خوشیوں میں ڈوب جاتی اس عمر میں تصوراتی دنیا کا حسن انگ انگ میں بستا

ہے۔رگ رگ میں سماتا ہے۔نازو تو اس حسن میں گہرے گہرے شوخ رنگ بھی بھرنے لگی تھی۔۔۔۔۔۔۔اسے لگتا وہ اپنے جیون ساتھی کے دل کے سنگھاسن پر ایک دیوی کی طرح براجمان ہے اور وہ آنکھیں بند کئے ہاتھ جوڑے اس کے سامنے سرنگوں بیٹھا اس کی حاکمیت اور برتری کے احساس سے مرعوب ہے۔

یہ احساس سہیلیوں اور بھابیوں کی پیار بھری تعریفوں سے روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔

انہی دنوں نازو کو بڑی بھابی کے میکے میں کسی تقریب میں خرم کی امی نے دیکھا۔پہلی نظر ہی میں وہ شائستہ بیگم کے دل میں اتر گئی۔

''یہ لڑکی کون ہے؟''انہوں نے بھابی کی امی سے پوچھا۔

''میری عاصمہ کی نند ہے۔۔۔۔۔۔۔نازینہ۔۔۔۔۔۔۔پیار سے سب اسے نازو کہتے ہیں۔''

''بڑی پیاری بچی ہے۔''

''ہاں بہت پیاری۔۔۔۔۔۔۔''

خرم کی امی اس کا حدود اربعہ پوچھنے لگیں تو بھابی کی امی نے مسکرا کر دیکھا اور بولیں ''کیا بات ہے؟''

''مجھے اپنے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش تھی۔۔۔۔۔۔۔یہ لڑکی میرے دل کو بھا گئی ہے۔''

''آپ کا بیٹا آج کل کیا کر رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔تعلیم کتنی ہے؟''

''خرم نے ایم اے کے بعد ایک سال تو یہاں نوکری کی تھی۔پھر باہر چلا گیا۔سعودی عرب میں ہے۔بینک میں۔۔۔۔۔۔۔ماشاء اللہ بہت بڑی تنخواہ لے رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔شکل وصورت میں بھی اچھی ہے۔شرافت کا بھی مول نہیں ہیرا ہے میرا بیٹا۔۔۔۔۔۔۔ہیرا۔۔۔۔۔۔۔''

خرم کی امی عاصمہ کی امی کی رشتہ دار تھیں۔انہوں نے اس رشتہ کے حصول کے لیے عاصمہ کی امی کی مدد چاہی۔

''نہ بھئی''وہ بولیں ''میری بیٹی کے سسرال کا معاملہ ہے۔میں تو بیچ میں نہیں آؤں گی۔ہاں آپ کو لڑکی پسند ہے۔تو خود بات کر لیں۔مل لیں اس کی امی سے۔''

''کہاں ہیں وہ۔۔۔۔۔۔۔؟''

''وہ سامنے بیٹھی ہیں۔آف وائٹ کپڑوں والی گوری چٹی عورت۔۔۔۔۔۔۔وہ جو رخسانہ سے باتیں کر رہی ہیں۔''

خرم کی امی براہ راست بات کرنے سے ہچکچائیں انہوں نے عاصمہ کی امی سے کہا ''چلو تم بیچ میں نہ آنا چل کر تعارف تو کروا دو۔۔۔۔۔۔۔''

''ٹھیک ہے چلئے۔''

خرم کی امی نازو کی امی سے ملیں۔پہلی ملاقات ہی میں وہ ان سے گھل مل گئیں۔ان کے گھر کا پتہ پوچھا اور اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔

گھر آ کر انہوں نے خرم کے ابا جی سے بات کی رمل اور کنول کو نازو کے متعلق بتایا۔

''بھیا کے لیے خوبصورت لڑکی چاہئے امی خرم بھیا کی یہی فرمائش ہے۔''

''بہت خوبصورت بڑی خوش اخلاق لڑکی ہے۔خاندان بہت معزز ہے۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔۔پروگرام بناتے ہیں ان کے ہاں جانے کا۔''

رمل اور کنول امی کے ساتھ نازو کے ہاں گئیں نازو انہیں اتنی بھائی کہ بس دل و جان سے فدا ہو گئیں دونوں نے اسے بھابی بنانے کا تہیہ کر لیا۔

''امی یہی لڑکی خرم بھیا کی پسند کے معیار پر پوری اترے گی۔یہ رشتہ ضرور کرنا ہے۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے۔''

''اپنے خرم بھیا بھی تو شہزادوں سے کم نہیں پھر اتنی بڑی تنخواہ لے رہے ہیں۔تین سالوں ہی میں ہمارے گھر کی حالت بدل دی ہے انہوں نے۔۔۔۔۔۔۔کتنے ٹھاٹ باٹ ہو گئے ہیں۔اتنی اتنی قیمتی چیزوں سے گھر بھر دیا ہے۔''

''ماشاءاللہ کہا کرو۔''

''ماشاءاللہ ماشاءاللہ'' دونوں بہنیں ہنس پڑیں۔

اگلے دن ماں بیٹیاں باقاعدہ رشتہ لے کر گئیں۔خرم کی تصویر بھی ان لوگوں کو دکھا دی۔۔۔۔۔۔۔امی نے خرم کے متعلق تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا میرا بیٹا ہیرا ہے ہیرا اتنا شریف محنتی اور کماؤ لڑکا ہے کہ آپ اپنی بیٹی کی قسمت پر بجا طور پر فخر کر سکیں گی۔'' نازو کی امی مسکرا کر چپ ہو رہیں ان لوگوں کی خوب خاطر مدارت کی۔

''ہم پھر آئیں گے۔آپ جواب سوچ رکھئے۔'' اٹھتے ہوئے رمل نے مسکرا کر کہا۔

نازو کی امی اور بھابیوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

بات دراصل یہ تھی ۔۔۔۔۔۔۔ کہ ان دنوں نازو کے لیے ایک دو رشتے اور بھی آ رہے تھے۔ ایک لڑکا انجینئر تھا اور کراچی کی اسٹیل مل میں ملازم تھا۔ دوسرا یہیں لاہور میں تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور کسٹم میں لگا ہوا تھا۔

گھر والوں کو اسٹیل مل کا انجینئر پسند تھا۔ امی کو لاہور والا رشتہ۔۔۔۔۔۔۔ سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ اسے قریب اور آنکھوں کے سامنے رکھنے کی خواہش فطری تھی۔

خرم کا رشتہ بھی آزمائش میں ڈالنے والا تھا اتنی تنخواہ تھی۔ لوگ بھی اچھے ہی لگے تھے۔ عاصمہ کی امی نے کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا تھا۔ لیکن اس گھرانے کی شرافت کی تعریف ضرور کی تھی۔ خرم کے بارے میں بھی تسلی دی تھی ''بڑا ہونہار لڑکا ہے۔ گھر کی کایا اسی نے پلٹی ہے۔ ورنہ باپ بیچارہ تو ساری عمر ہیڈ کلرکی کرتا رہا خرم کی کمائی سے اب گھر بھی سج گیا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ ہی سہی گاڑی بھی لے دی ہے۔ ابا کو۔۔۔۔ بھائی کو اسکوٹر دلوایا ہے۔ بہنوں کے لیے ایک سے ایک اعلیٰ چیز بھجوا رہا ہے۔۔۔۔۔ لڑکا ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک ہے۔''

یہ رشتہ موزوں تھا۔ اس پر بھی غور کیا جانا ضروری تھا۔

اماں اب بھی اس رشتے پر لاہور والے رشتے کو ترجیح دے رہی تھیں۔ بڑے بھیا اب بھی انجینئر کے حق میں تھے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن دو بھابیوں اور چھوٹے بھیا نے خرم کے حق میں ووٹ دیا تھا اب سب کے سب ابا جی کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔

ابا جی نے انوکھا فیصلہ دیا۔ ''بھئی رشتے تینوں اچھے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ یا تو لاٹری سسٹم کر لو۔ یا پھر نازو سے پوچھ لو۔''

''نازو سے رائے لے لیتے ہیں۔'' بھابی نے کہا۔

''ہاں ہاں پوچھ لو اس سے۔'' ابا جی نے کھلے دل سے اجازت دے دی۔

عاصمہ نے نازو کے سامنے تینوں رشتوں کا بائیو ڈیٹا رکھ دیا۔

''محترمہ'' بھابی ہنس کر بولیں۔ ''تینوں رشتے اچھے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کر کے بھی جس پر انگلی رکھ دو گی وہاں بات طے ہو جائے گی۔۔۔۔۔۔۔ لیکن بہتر ہے آنکھیں کھول کر دیکھو۔۔۔۔۔۔۔ اور دماغ استعمال کر کے پرکھو۔''

نازو شرما گئی۔

لیکن اس نے خرم کی بن جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے ملک سے باہر جانے کا شوق تھا۔ یورپ' امریکہ دیکھنے کی خواہش تھی۔ مڈل ایسٹ گھوم پھر کر دیکھنے کا شوق شاپنگ کا جنون تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور حج کی سعادت حاصل کرنے کی بھی لگن تھی۔ یہ ساری باتیں صرف

خرم کے نام پر انگلی رکھ دینے ہی سے پوری ہو سکتی تھیں۔

اس نے بھابیوں سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

رشتہ طے پا گیا۔

بڑی دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ خرم کی امی منگنی پر نازو کے لیے اتنے کپڑے اور زیور لائیں کہ شادی پر لائی جانے والی بری کا گمان ہونے لگا خرم کی بھیجی ہوئی موٹے سے ڈائمنڈ والی انگوٹھی نازو کو پہنائی گئی ۔۔۔۔۔۔۔ بڑی قیمتی انگوٹھی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ نازو اپنے مقدر پر پھولی نہ سمائی۔ یہی حال سب گھر والوں کا تھا۔ شادی کی تیاریاں زور شور سے ہونے لگیں۔

خرم کو اطلاع کر دی گئی۔ منگنی کی تصویریں بھی بھیجی گئیں۔ نازو کے انتخاب پر اس نے امی کو مبارک باد لکھ کر اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کر دیا۔ شادی کے لیے اس نے بہت کوشش کی کہ دو ماہ کی چھٹی مل جائے لیکن جس محکمے میں وہ تھا۔ ایک ماہ کی چھٹی بھی غنیمت ہی تھی۔ شادی کی تاریخ خرم کی چٹھی کے حساب سے ہی طے ہوئی۔ خرم نے تو فون کیا تھا کہ جس دن وہ پہنچے دوسرے دن ہی شادی رکھ دی جائے تا کہ وہ اپنی دلہن کے ساتھ باقی دن گزار سکے۔ لیکن شادی ایک ہفتہ گزرنے پر رکھی گئی۔ یوں خرم کے پاس کل تین ہفتے بچے ان میں سے بھی دو تین دن واپسی کی نذر ہونا تھے۔

شادی مقررہ تاریخ پر ہو گئی۔ دونوں طرف سے پیسے کا خاصا ضیاع بھی کیا گیا۔ لیکن یہ شادی دونوں خاندانوں میں ایک یادگار شادی قرار دی گئی۔

نازو خوبصورت عروسی لباس میں زیورات سے لدی خرم کے حجلہ عروسی میں آ پہنچی۔

پھر معطر معطر خراماں خراماں خرم اندر آ گیا۔

وہ سنہری روپہلی گٹھڑی بنی اور پھر سمٹ گئی۔ بوجھل قدموں کی چاپ ہی دل دھڑکا گئی تھی اسے لگ رہا تھا۔ وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔

خرم بیڈ کی پٹی پر آ بیٹھا۔ رنگوں اور خوشبوؤں کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے نازو کا گھونگھٹ الٹ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ اس حسین معصوم اور پاکیزہ چہرے کو چند لمحے ساکت نظروں سے تکتا رہا۔ وہ تصویر سے کہیں زیادہ حسین و پرکشش تھی۔

''نازو'' خرم نے مخمور سی سرگوشی کی آنکھیں کھولو نازو ۔۔۔۔۔۔۔ دیکھو نا ۔۔۔۔۔۔۔ میری طرف مجھے نہیں دیکھو گی؟

۔۔۔۔۔۔آنکھیں کھولو۔۔۔۔۔۔"

چاہتوں اور محبتوں کے ان گنت تقاضوں سے بھرپور آواز نازو کے دل میں تلاطم بپا کر رہی تھی۔ اس نے اپنے جیون ساتھی کے اصرار پر ایک لمحہ کے لیے آنکھیں کھولیں۔ خرم کی سیاہ خوبصورت آنکھوں میں جانے کیا تھا۔ وہ تاب نہ لاسکی اس کی آنکھوں پر پلکوں کی چلمنیں گر گئیں۔

دوسرے دن دعوت ولیمہ ہوئی۔ اور تیسرے دن دونوں ہنی مون منانے چلے گئے۔ مری' کاغان' سوات' کالام وہ دو ہفتے انہی علاقوں میں گھومتے رہے۔

دن پنکھ لگا کر اڑتے چلے جا رہے تھے۔ گو وقت ان کے لیے شب و روز کی قید سے آزاد تھا لیکن بیت تو رہا تھا گزرنے کی سچائی سے منحرف تو نہیں تھا۔ اس دن جب دونوں واپسی کے لیے سامان پیک کر رہے تھے۔ دونوں کے چہرے اداس تھے۔

"دو ہفتے گزر بھی گئے۔۔۔۔۔۔" خرم نے گھمبیر آواز میں کہا۔

"احساس ہی نہیں ہوا۔" وہ کپڑا تہہ کرتے ہوئے بولی۔

"احساس تو اب ہو رہا ہے۔"

"ہاں"

"میرے جانے میں صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں۔ نازو" خرم نے بوجھل لہجے میں کہا۔

فرق کی بے رحم آنکھیں پوری سفاکی سے انہیں گھور رہی تھیں۔ دونوں بچھڑنا نہیں چاہ رہے تھے لیکن انہیں بچھڑنا تھا۔ یہ ایسا سچ تھا۔ جسے جھوٹ کہہ دینا دونوں کے بس میں نہیں تھا اور۔۔۔۔۔۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب خرم کو واپس جانا تھا۔ ساری رات دونوں نے جاگتے گزار دی تھی۔ نازو تو رو رو کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ "خرم" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے بغیر رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ خرم۔۔۔۔۔۔ کیسے گزاروں گی شب و روز۔۔۔۔۔۔"

خرم کا اپنا جی بھی تھوڑا ہو رہا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ اگر وہ بھی نازو ہی کی طرح تڑپ کا اظہار کرے گا۔ تو نازو بن جل مچھلی کی طرح تڑپتی رہے گی۔ اس نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی وہ جانتا تھا کہ ایک سال سے پہلے چھٹی نہیں ملے گی۔ اس کی کمپنی کے ضابطے ہی کچھ ایسے تھے کہ ایک سال سے پہلے بیوی کو لے جانے کی بھی اجازت نہ ہوگی اور تو اور اس سال وہ بیوی کو حج کے لیے بھی نہ بلا سکے گا۔ کیونکہ پچھلے دو سالوں سے وہ متواتر حج کر رہا تھا اس لیے اس دفعہ سختی سے پابندی تھی

۔۔۔۔۔۔۔ یہ باتیں وہ نازو کو بتا دینا چاہتا تھا لیکن نازو کی جو حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے وہ ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے یہی سوچا واپس جا کر سب کچھ خط میں لکھ دے گا۔ یا فون پر بتا دے گا۔ فی الحال تو اسے تسلی اور دلاسہ دینے کی ضرورت تھی۔

''نازو۔۔۔۔۔۔۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تم سے بچھڑنے پر میری کیا حالت ہو گی لیکن جانا تو ہے ہی میں کوشش کروں گا کہ تمہیں جلد ہی بلوا لوں۔''

''خرم۔۔۔۔۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی خرم۔''

''پگلی۔۔۔۔۔۔۔ یوں ہمت ہارو گی تو میں جا کیسے پاؤں گا۔''

''مت جاؤ!''

وہ ہنس پڑا۔۔۔۔۔۔۔

''سچ کہتی ہوں خرم۔۔۔۔۔۔۔ مجھے نہیں چاہئے تمہاری بھاری بھر کم تنخواہ۔۔۔۔۔۔۔ نہ جاؤ۔ یہیں نوکری ڈھونڈ لینا۔ ہم تھوڑے میں جی لیں گے۔۔۔۔۔۔۔ بہت کما لیا ہے۔۔۔۔۔۔۔''

''پگلی'' خرم نے اسے پیار سے تھپتھپایا۔

خرم چلا گیا۔۔۔۔۔۔۔ سب کے ساتھ وہ بھی اسے ایئر پورٹ چھوڑنے گئی۔۔۔۔۔۔۔ رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ طیارہ اڑا تو اسے یوں لگا اس کی زندگی سے خوشیوں کا وجود بھک سے اڑ گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس کی ساس نے ہنستے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔۔۔۔۔۔۔ بھابیوں نے بھی پیار کیا۔ مذاق کرنے لگیں۔۔۔۔۔۔۔ اسے خوش کرنے اور چھیڑنے کے لیے اس کے آنسو بہانے کی نقلیں مارنے لگیں۔ رمل اور کنول نے بھی اسے لپٹا کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''واہ بھابی' اس طرح بھی کوئی کرتا۔۔۔۔۔۔۔''

''مجھ سے بھی میرا بیٹا جدا ہوا ہے۔'' ساس نے کہا۔ ''حوصلے اور صبر سے کام لو بیٹی۔ وہ ہماری بہتری ہی کے لیے دور دیس گیا ہے نا.....''

نازو کا جی چاہا چلا کر کہے ''کوئی بہتری نہیں ہے۔ صرف پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں۔ میرے لیے خرم' اس کی شخصیت' اس کا وجود اہم ہے۔۔۔۔۔۔۔''

گھر آئی تو نازو کو کمرے پر چھائی ویرانی کا احساس ہوا۔ خرم ہی رونق محفل اور جان جہاں تھا۔ وہ چلا گیا تو جیسے باقی کچھ نہ بچا۔۔۔۔۔۔۔ وہ گھبرا گئی۔۔۔۔۔۔۔ دماغ چکرانے لگا۔ دل بیٹھ بیٹھ گیا۔۔۔۔۔۔۔ اس کمرے میں اب وہ اکیلی کیسے رہے گی۔

پہاڑ سا دن اور طویل ٹھنڈی یخ بستہ راتیں کیونکر گزارے گی۔۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ سوچ کر ہی اس کا جی ہول کھانے لگا۔ وہ بہت پژ مردہ نڈھال اور افسردہ تھی۔۔۔۔۔۔۔ رمل اور کنول آ گئیں۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے نازو کو بہلانے لگیں۔ امی ابا جی اور انجم بھی آ گئے۔

''میں آپ کے پاس سویا کروں گی بھابی!'' کنول نے پیار سے کہا۔

رمل بولی ''حوصلہ رکھئے ہم آپ کو خرم بھائی کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیں گے۔''

انجم نے بھی ڈھارس بندھائی۔ ''بھابی میں آپ کو گھمانے لے جایا کروں گا۔''

''بیٹی'' ساس نے محبت سے کہا۔ ''دونوں گھر تمہارے اپنے ہیں۔ جب جی اداس ہو۔ امی کے ہاں چلے جانا۔''

ابا جی شفقت سے بولے۔ ''ہم تم پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائیں گے بیٹی۔ جیسے خوش رہو رہنا۔ ہم سب تمہارا دل بہلائیں گے۔ وقتی بات ہے۔ عادی ہو جاؤ گی۔۔۔۔۔۔۔''

نازو بن آنسوؤں کے روئے گئی۔

وقت تھم تھم کر چلنے لگا۔ وہی دن جو خرم کے ہوتے پنکھ لگا کر اڑ گئے تھے۔ اب لگتا تھا مجروح لمحوں کی زنجیر ہیں۔

وہاں پہنچتے ہی خرم نے فون کیا۔ نازو فون پر بھی ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔ خرم نے طویل خط لکھنے کا وعدہ کیا پھر خرم کا خط بھی آ گیا۔ لیکن نازو سنبھل نہ سکی۔ اس کے دن پریشان اور راتیں ویران ہو گئی تھیں۔ سنہرے روپہلے سپنے جدائی کی تعبیر سے دوچار ہو چکے تھے۔ اسے خرم کی آواز یا تحریر کی ضرورت نہ تھی۔ اسے خرم کی ضرورت تھی۔ اس کی مضبوط بانہوں کی ضرورت تھی۔ بہلاوے اس کے کام نہیں آ سکتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ خطوں سے اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔

وہ بڑی مضمحل اور نڈھال سی ہو گئی۔ اس کی بھابی اسے لینے آ گئیں۔ اس کی ساس سے اجازت لی چند دنوں کے لیے اسے میکے لے آئیں۔ لیکن نازو کا دل وہاں بھی نہ لگا۔ یہ گھر جہاں وہ پیدا ہوئی تھی پلی بڑھی تھی۔ اتنا بیگانہ لگا کہ وہ خود گھبرا گئی۔ وہ دوسرے ہفتے ہی واپس آ گئی۔۔۔۔۔۔۔ اپنے گھر میں خرم کے گھر میں۔ لیکن طبیعت کی بے کلی نہ گئی۔ وہ ہر خط میں خرم کو لکھتی ''یا مجھے بلا لو۔ یا خود آ جاؤ۔ میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔ مجھ سے تمہارے بغیر نہیں رہا جاتا۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے دل لگانے اور اپنے آپ کو بہلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ گھر کا کام کاج کرنے لگی۔ کچن میں گھس جاتی۔ ساس سسر کے کپڑے استری کر دیتی رمل اور کنول کو لباسوں کے نئے نئے ڈیزائن بنا بنا کر دیتی۔ اس سے اتنا فرق پڑا کہ دن جیسے تیسے گزر

جاتا لیکن جب رات ڈھلتی تو اس کے من کی ساری ویرانیاں جاگ اٹھتیں رِل اس کے ساتھ ہی سوتی تھی۔ نازو چپکے چپکے خرم کی تصویر سینے سے لگا کر اس سے گلے شکوے کرتی روتی۔۔۔۔۔۔۔روٹھ جاتی۔۔۔۔۔۔۔پھر خود ہی مان جاتی۔

خرم ہر خط میں تسلی دیتا۔ ''تمہیں بلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔فکر نہ کرو۔ دل لگانے کی کوشش کرو'' چھ سات مہینے یونہی گزر گئے۔ نازو کی سوچ اور احساس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔۔۔۔۔۔۔ویرانی اسے ڈستی رہتی تھی۔ خرم کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا رہتا۔ اب تو اسے خرم پر غصہ بھی آنے لگا تھا۔ کیا وہ اسی لیے شادی کر کے گیا تھا کہ اسے جوان بھائی بہنوں اور بوڑھے ماں باپ میں گھرا چھوڑ جائے۔۔۔۔۔۔۔یہ سب لوگ اسے بالکل اجنبی لگتے۔ خرم ہی کے رابطے سے تو وہ ان سے بندھی تھی ورنہ وہ کون تھے؟'' وہ پاگلوں کی طرح سوچتی رہتی۔

خرم نے کئی آنے جانے والوں کے ہاتھ سب گھر والوں کو تحفے بھیجے تھے۔ اب وہ نازو کو الگ چیزیں بھیجتا کبھی خوبصورت قیمتی کپڑے، کبھی سونے کی کوئی چیز تو کبھی ڈائمنڈ کا نفیس زیور نازو کو ان چیزوں نے کبھی خوشی نہ دی۔ حالانکہ کبھی وہ ان چیزوں کی دیوانی ہوا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔۔یہ چیزیں اب اس کی زندگی میں ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔۔۔۔۔۔۔اسے خرم چاہئے تھا۔

اسے اداس دیکھ دیکھ کر بھابیاں کڑھتیں۔ امی کو دکھ ہوتا۔

''کوئی بچہ ہی ہو جاتا۔ تو بہل جاتی۔'' ایک دن بڑی بھابی نے کہا۔

''مجھے تو بڑی امید تھی۔'' چھوٹی بولی۔ ''بہت اچھا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔بچہ ہو جاتا۔۔۔۔۔۔۔نو ماہ یوں گزرتے دو ماہ زچگی کی نذر ہو جاتے۔ سال بھر کا عرصہ گزرتے پتہ بھی نہ چلتا۔''

''خدا کی جو مرضی''

''ویسے نازو بہت اپ سیٹ رہتی ہے کبھی تو بالکل پاگل کی سی باتیں کرنے لگتی ہے۔''

''بہت حساس ہے۔''

''خرم بھی تو کچھ کر نہیں رہا۔ اب تک چاہئے تھا اسے بلا لیتا۔''

''بھئی اس کی بھی کوئی مجبوری ہو گی۔''

''خرم تو بہت پیار کرتا ہے نازو سے۔''

''کیا کیا جائے۔ بہلتی بھی نہیں۔''

''بہت پریشان رہتی ہے۔''

''مجھے تو ڈر لگتا ہے کہیں اس کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔''

''ہوں''

وقت کی یہی اچھی عادت ہے کہ رکتا نہیں گزرتا ہے اور گزرتا چلا جاتا ہے۔ جو کہیں تھم جائے تو جانے کیا ہو جائے نازو کے شب و روز بھی تو وقت کی قید میں تھے اچھے برے گزر ہی رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔ انتظار کا کرب آمیز مزہ چکھ رہی تھی۔ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہی تھی۔ اس کا ویزا نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ خرم نے لکھ دیا تھا کہ اب کے خود آئے گا تو ویزا ساتھ لائے گا۔۔۔۔۔۔۔ پاسپورٹ تو نازو نے کب کا بنوالیا تھا۔

لیکن

خرم کو اپنی سال بھر کی مقررہ مدت سے پہلے ہی آنا پڑا۔ اس کی امی اچانک ہی بیمار پڑ گئیں۔ پہلے تو اسے اطلاع ہی نہ دی گئی۔ لیکن جب بیماری نے تشویشناک صورت اختیار کی تو اطلاع دینا پڑی چھٹی کے معاملے میں اس کی کمپنی کے قواعد وضوابط بہت سخت تھے۔۔۔۔۔۔۔ پردیس کا معاملہ' نہ کوئی ساتھی نہ غمخوار' خرم پر قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔ ہر خط ماں کے بچھڑنے کا احساس دلا رہا تھا۔ بالآخر جب ماں کے بچنے کی ساری امیدیں ٹوٹ گئیں۔ تو اسے فون پر مطلع کیا گیا ارجنٹ تار دیئے گئے۔۔۔۔۔۔۔ تب کہیں جا کر اسے اٹھائیس دن کی چھٹی ملی۔

امی کی جو حالت تھی۔ اس سے سب گھر والے پریشان تھے۔ رمل اور کنول تو رو رو کر بے حال ہوئی جاتی تھیں۔ ابا جی کا لگتا تھا حوصلہ ہی ٹوٹ گیا ہے اور بیچارہ انجم بھی چھپ چھپ کر روتا تھا۔ نازو نے ساس کی خدمت میں دن رات ایک کر دیئے تھے۔ اپنا دکھ بھول گئی تھی۔

خرم کے آنے کی اطلاع کی تو نازو کے دل کی مرجھائی کلیاں آپ ہی آپ کھل اٹھیں۔ گو اس کا آنا ایسے موقع پر تھا کہ چین سے بیٹھنے کی امید تک نہ تھی۔ پھر بھی وہ جان تمنا جان بہاراں آ تو رہا تھا۔ وہ ایسے موقع پر خوشی کا اظہار برملا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن خوشی تو اس کے اندر سوتوں کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ سنبل بھی کراچی سے آ گئی تھی۔ ماں کی پریشانی میں اسے بھابی کا یوں کھل اٹھنا اچھا نہ لگا۔ لیکن ویرانے میں چپکے سے بھی بہار آ جائے تو رنگ دکھائے بنا نہیں رہتی۔ نازو کا انگ انگ خرم کے استقبال کے لیے چشم براہ تھا۔

خرم جس دن پہنچا اس دن امی پر غشی کی کیفیت طاری تھی۔ نازو ایئرپورٹ پر بھی نہ جا سکی۔ اور خرم آتے ہی امی کے سینے پر ہاتھ

رکھ کر بے اختیار رو پڑا اسے اپنی امی بہت عزیز تھیں۔ نازو کی طرف تو وہ دھیان بھی نہ دے سکا۔

نازو اندر ہی اندر بجھ سی گئی۔ لیکن موقع ایسا تھا کہ وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔۔۔۔۔۔۔ اسی شام امی کو اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ پھر جو دوڑ دھوپ شروع ہوئی تو خرم کو نازو کا ہوش رہا نہ نازو کو خرم کی خبر۔۔۔۔۔۔۔ خرم نے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن امی کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔

وہ دن جیسے روز حشر تھا۔ خرم کبھی ابا جی سے لپٹ جاتا کبھی بھائی بہنوں کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ تسلی دینے کا موقع ہی کہاں تھا۔ یہ دن تو غم واندوہ کے بھرپور اظہار کا دن تھا۔ تین ہفتے کی دوڑ دھوپ رائیگاں گئی تھی۔ خرم بے حال ہوا جا رہا تھا۔ نازو اس کے غم میں برابر کی شریک تھی۔

اگلے ہفتے خرم کی واپسی تھی بہت پژمردہ بہت نڈھال ہو رہا تھا۔

خرم کی روانگی سے ایک رات پہلے ابا جی نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ باپ بیٹا بڑی دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ امی کی باتیں یاد کر کے روتے رہے نازو، رمل، سنبل اور کنول بھی یاد آ گئیں۔ بچھڑنے والی کو آنسوؤں کا خراج پیش کیا گیا۔

ابا جی نے ہی خود کو سنبھالا۔ آنسو پونچھ کر بولے۔ ''خرم بیٹے تم کل جا رہے ہو۔''

''جی ابا جی'' وہ بھی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

''جانے سے پہلے میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ نازو بیٹے تم بھی سن لو۔''

''جی کہیے'' خرم بولا۔ نازو نے بھی سوالیہ نظروں سے ابا جی کو دیکھا۔

ابا جی نے تمہیداً چند کلمات اخراجات کے متعلق کہے۔ پھر بولے۔ ''تم نے بہت روپیہ کمایا ہے۔ خرم بیٹے لیکن اب میرے پاس بینک میں صرف سات آٹھ ہزار روپیہ ہے۔ پہلے گھر کی مرمت وسجاوٹ ہوئی تھی۔ پھر تمہاری شادی اور اب تمہاری ماں کا انتقال، سارا روپیہ بے دریغ خرچ کیا گیا۔ اب تم جانتے ہو رمل اور کنول کی شادیاں کرنی ہیں۔ انجم ابھی پڑھ رہا ہے۔ وہ چند لمحے رکے۔ نازو کا تو سانس رکنے لگا تھا۔ خرم کی اتنی کمائی میں کل سات آٹھ ہزار ہی بچا تھا۔ اس نے گھبرا کر خرم کو دیکھا۔ خرم بھی چپ تھا۔

ابا جی پھر بولے۔ ''کہو تو سارا حساب بتا دوں؟''

''نہیں ابا جی'' خرم جلدی سے بولا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں انشاء اللہ اب بھی پہلے کی طرح روپیہ بھیجتا رہوں گا۔ آپ رمل اور کنول کے لیے مناسب رشتے تلاش کریں۔''

سنبل چپ بیٹھی تھی۔ رشتوں کی بات ہوئی تو بولی۔ ''میرے سسرال میں دو ایک لڑکے ہیں رمل کے لیے وہ شاید بات کریں۔ تم اپنا بجٹ دیکھو۔ بات پھر چلاؤں گی۔''

''کتنا پیسہ درکار ہوگا؟'' خرم نے پوچھا تو سنبل نے جہیز کی تفصیل گنوانا شروع کر دی۔ جو کچھ بنا رکھا تھا وہ بھی بتایا اور جو کچھ مزید بنانا تھا وہ بھی بتا دیا۔ جتنا کچھ بن چکا تھا شادی اس میں بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن سنبل تو بھائی کی تنخواہ کے حساب سے بھاری بھرکم جہیز اور شاندار شادی کا تخمینہ بتا رہی تھی۔

نازو کو دھچکا سا لگا۔ یہ تو صرف رمل کے لیے ہونا تھا۔ ابھی تو کنول بھی تھی اور انجم بھی۔۔۔۔۔۔۔ تو کیا خرم انہی کے لیے قید تنہائی کاٹتا رہے گا؟ ان کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے' فضول اور لغو رسموں پر اڑانے کے لیے' نام و ناموس کے مصنوعی خول میں رنگ بھرنے کے لیے کماتا رہے گا۔۔۔۔۔۔۔ وہ کہاں جائے گی؟۔۔۔۔۔۔۔ ابا جی یا سنبل نے اب تک اپنی باتیں ہی کی تھیں۔ اپنے ہی رونے روئے تھے۔ دونوں میں ایک نے بھی اس کے متعلق بات نہ کی تھی۔ بیٹے کو یہ نہیں سمجھایا تھا کہ تو نئی دلہن کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب بھی جا رہا ہے۔ اسے وہاں بلانے کا بندوبست کر۔۔۔۔۔۔۔ سنبل نے بھائی کو ایک بار بھی یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ اب تیرا گھر بھی بس گیا ہے۔ تو جو پردیس کی خاک چھان رہا ہے۔ کچھ اپنے لیے بھی جمع کر کب تک پردیس میں رہے گا۔۔۔۔۔۔۔ واپس بھی آنا ہے واپسی تک اتنا تو جمع کر لے کہ کوئی کاروبار کر سکے۔

نازو کا دماغ سوچ سوچ کر پھٹنے لگا۔ وہ وہاں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکی۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد خرم اپنے کمرے میں آیا۔ نازو کے اندر طوفان سے اٹھ رہے تھے۔ خرم کی صبح سات بجے کی فلائٹ تھی۔ اور وہ نازو کو نظر انداز کر کے باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ مستقبل کے پلان ترتیب دے رہا تھا۔ نازو کے جذبات میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اک جوالا مکھی تھی جو پھٹ پڑنے کو تھا۔

''جاگ رہی ہو ابھی'' خرم تے آتے ہی پوچھا وہ بہت ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ نازو کچھ نہیں بولی منہ موڑے لیٹی رہی۔

''نازو'' وہ اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے دکھی آواز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں تمہارے دل پر کیا بیت رہی ہے میں کل جا رہا ہوں۔ اس دفعہ کا آنا تو نہ آنے کے برابر ہی تھا۔ حالات ہی ایسے ہو گئے میں تمہیں کوئی سکھ نہ دے سکا۔ تم'' تم'' نازو نے اس کی طرف کروٹ بدلی۔ ''تم۔۔۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ مجھے وہاں کب بلا رہے ہو؟''

اس کے لہجے کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے خرم نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ خاصی اپ سیٹ لگ رہی تھی۔ خرم نے جواب

دینے کی بجائے اسے قریب کرنا چاہا۔لیکن وہ پرے ہٹتے ہوئے بولی۔''خرم' تم نو دس ماہ کے بعد واپس آئے ہو۔دس مہینوں میں تم مجھے اپنے پاس بلانے کا بندوبست نہیں کر سکے۔''

خرم اس لہجے سے آشنا نہیں تھا۔پھر نازو کی طرف دیکھا۔وہ برہم تھی۔بولی''تم میری بات کا جواب نہیں دے رہے۔''

بتاؤ نا اب کیا پروگرام ہے۔۔۔۔۔۔کیا تم پھر سال بھر کے لیے مجھے اس قید خانے میں سزا کاٹنے کے لیے چھوڑ کر جا رہے ہو۔''

''نازو۔۔۔۔۔۔۔''خرم نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''خرم میں ایسی زندگی کی عادی نہیں ہوں میں نے ہمیشہ جو چاہا سو پایا۔۔۔۔۔۔۔لیکن اب۔۔۔۔۔۔۔اب تم میرے سارے خواب چکنا چور کر رہے ہو۔میں نے تم سے جتنی امیدیں' جتنی خوشیاں' جتنے تصورات وابستہ کئے تھے۔۔۔۔۔۔۔تم نے ان پر پانی۔۔۔۔۔۔۔''

''نازو۔۔۔۔۔۔۔''خرم کے لہجے میں التجا تھی۔

''مجھے بولنے دو خرم۔۔۔۔۔۔۔میں نے آٹھ دس ماہ کا تیاگ جس طرح کاٹا ہے میں جانتی ہوں۔اب اب مجھ میں صبر ہے نہ ہمت مجھے بتاؤ کب تک بلا لو گے مجھے۔۔۔۔۔۔۔''

خرم کچھ نہیں بولا۔۔۔۔۔۔۔ابا جی نے بھی تو اپنا فیصلہ اس کے گوش گزار کیا تھا۔۔۔۔۔۔۔''اب تمہاری ماں نہیں۔دو جوان بہنیں ہیں نازو کی ان کو ضرورت ہے۔۔۔۔۔۔۔انجم کی دلہن آنے تک نازو کا گھر میں رہنا ضروری ہے بیٹے۔۔۔۔۔۔۔''

خرم کو اس فیصلے سے ذہنی کوفت ہوئی تھی لیکن باپ کی مجبوری تھی کیا کرتا؟

''میں نے کہا نا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی نہیں رہوں گی۔۔۔۔۔۔۔''وہ اس طیش سے بولی۔

''نازو''خرم کو بھی غصہ آ گیا''حالات کو دیکھو ان کی روشنی میں بات کرو۔۔۔۔۔۔۔میں تمہیں کیسے وہاں بلا سکتا ہوں۔''

خرم کا یہ جملہ بجلی بن کر نازو کے اعصاب پر گرا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ پاگلوں کی طرح خرم کو تکنے لگی۔

خرم کچھ ڈر سا گیا۔

''نازو۔۔۔۔۔۔۔نازو۔۔۔۔۔۔۔''وہ اسے بازوؤں میں بھر کر سمجھانے لگا۔۔۔۔۔۔۔لیکن وہ تو جیسے پتھرا گئی تھی۔خرم نے اپنی مجبوری' ابا کی مجبوری' جوان بہنوں کی مجبوری کے حوالے سے بات کی۔۔۔۔۔۔۔اپنی حالت بتائی۔اس کے بغیر وہ بھی سکون سے نہیں رہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔لیکن کیا کرتا نازو کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی۔چند لمحے تو پتھرائی سی رہی پھر خرم سے لپٹ کر زور زور

سے رونے لگی۔۔۔۔۔۔۔خرم اسے چپ کرانے لگا۔

کچھ دیر بعد نازو نے آنکھیں پونچھ ڈالیں' تکیے کے سہارے اٹھ بیٹھی اور مستحکم آواز میں بولی ''خرم جاتے ہی مجھے وہاں بلا لینا ۔۔۔۔۔۔۔میں اس طرح تیاگ کی زندگی نہیں گزار سکتی ۔۔۔۔۔۔۔میری راتیں رو رو کر گزرتی ہیں۔دن چین وسکون سے نا آشنائی میں گزار رہی ہوں۔تمہیں ذرا بھر خیال نہیں۔صرف باپ اور بہن بھائی تمہارے اعصاب پر مسلط ہیں۔''

خرم بولا۔''تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔باپ کی خدمت اور بہن بھائیوں کے حقوق سے منہ موڑ لوں میں بیٹا ہوں بھائی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔''

''اچھا تھا کہ صرف بیٹا اور بھائی رہتے۔شوہر کیوں بنے تھے؟'' نازو نے تلخی سے کہا۔خرم بات کی سنجیدگی کم کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے بولا۔شوہر بنا تھا۔تم جیسی لڑاکا حسینہ پانے کے لیے۔۔۔۔۔۔۔''

''بات مذاق میں نہیں ٹالو۔'' نازو اسی کاٹ دار لہجے میں بولی۔''میں تمہیں والدین کی خدمت سے نہیں روکتی نہ ہی بہن بھائیوں کے حقوق ادا کرنے سے۔لیکن خرم خدا کے لیے سوچو۔۔۔۔۔۔۔تم کتنی قربانی دے رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔پردیس میں قید تنہائی کاٹ رہے ہو۔شاید اپنے اوپر اپنی تنخواہ کا سوواں حصہ بھی خرچ نہیں کرتے ہو سب کچھ یہاں بھیج دیتے ہو۔اس سب کچھ میں سے تمہارے ابا کے پاس صرف سات آٹھ ہزار روپے بچے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔میں کہتی ہوں۔تمہاری اتنی محنت کی کمائی ان لوگوں نے کیوں بچا کر نہیں رکھی کیوں اپنا سٹینڈرڈ بڑھایا ہے۔چھوٹی موٹی چیز اب کسی کو پسند نہیں آتی رمل کی شادی کا تخمینہ سن لیا ہے؟ کیوں یہ شادی ان کے اپنے حالات کے اندر نہیں کی جاتی۔اس شادی کے لیے تمہیں اگلا سال بھی خون پسینہ ایک کرنا ہوگا میں کیا کروں۔کیوں ہوں۔میرا جگہ کہاں ہے یہ بھی کسی نے سوچا؟ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔''

خرم چپ رہا۔۔۔۔۔۔۔اسے برا بھلا کہا نہ تسلی تشفی دی۔۔۔۔۔۔۔ویسے اندر ہی اندر وہ یہ بات محسوس ضرور کرتا رہا کہ اب تک وہ لاکھوں روپے گھر بھجوا چکا تھا۔یہ سارا روپیہ جس بے دردی سے اڑایا جا چکا تھا اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

نازو روتے ہوئے بھی بولتی چلی گئی ۔۔۔۔۔۔۔خرم حوصلے سے سنتا رہا ۔۔۔۔۔۔۔آخر اس نے کہا۔''میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔''

''اپنے گھر والوں کو سمجھاؤ کہ اڑنا چھوڑ دیں۔اپنے ٹھکانے پر رہیں۔تمہاری محنت کی کمائی کو سنبھال کر رکھیں۔ان کو بتا دو کہ تم کسی تیل کے کنویں کے مالک نہیں۔وہاں ملازم ہو۔۔۔۔۔۔۔دن رات ایک کر کے پردیس کی صعوبتیں سہہ کر اپنوں سے بچھڑنے کی

سزا کاٹ کر یہ پیسہ کماتے ہو۔۔۔۔۔۔۔کبھی تمہیں وطن واپس بھی لوٹنا ہے۔ کچھ بچا کر رکھو گے تو اس وقت کام آئے گا۔'' نازو کے جلے دل سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔

''تم تو جو سزا کاٹ رہے ہو۔ سو کاٹ رہے ہو مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہو تم سب گھر والے'' وہ بلک اٹھی۔

''بس اب خاموش بھی ہو جاؤ۔'' نازو نے اس کے گھر والوں کو اتنا کچھ کہہ دیا تھا کہ خرم اس کا متحمل نہیں ہو سکا۔

خاصی دیر دونوں بحث و تکرار کرتے رہے۔ بالآخر خرم نے ابا جی کا فیصلہ اسے سنا ہی دیا۔

نازو چیخ اٹھی۔۔۔۔۔۔۔تم صرف ابا جی ہی کا سوچتے ہو۔ انہی کی سنتے ہو۔''

''میں ان کا بیٹا ہوں نازو۔''

''تو میرے کیا ہو۔''

''سوائے اس کے کہ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا اور کون سے حقوق ہیں جو میں نے پورے نہیں کیے۔ ہر ماہ تمہیں جیب خرچ نہیں ملتا؟ کپڑے اور زیورات نہیں بھجواتا۔ جہاں جاؤ جہاں چاہو رہو کیا اس کی آزادی تمہیں نہیں ہے؟''

''خرم وہ چلائی۔۔۔۔۔۔۔'' مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں ان سب چیزوں کے بغیر جی لوں گی تم صرف تم۔۔۔۔۔۔۔''

''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔۔۔۔۔۔۔وہ پاگلوں کی طرح بولی۔۔۔۔۔۔۔تم نہیں جاؤ گے مجھے چھوڑ کر۔۔۔۔۔۔۔''

خرم چلا گیا۔ نازو کا دماغ صدمے سے جیسے ماؤف تھا۔ وہ باؤلی سی ہو رہی تھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جاتا۔ اسی شام سنبل نے ان زخموں میں نشتر چبھو دیئے۔ سنبل اور رمل نے خرم اور نازو کی ساری چخ چخ دروازے سے کان لگا کر سن لی تھی۔ انہیں نازو پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

یہ غصہ طنز کے تیروں میں بدل گیا سنبل نے نازو سے کہا۔ ''بہت کان بھر لئے خرم کے لیکن سن لو۔۔۔۔۔۔۔وہی ہو گا جو ہم چاہیں گے۔ رمل اور کنول کی شادیاں دھوم دھام سے ہی ہوں گی اور جب تک یہ شادیاں نہیں ہو جاتیں۔ تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔''

دکھ اور صدمے سے نازو کے اعصاب ٹوٹنے لگے رو رو کر چیخ چیخ کر وہ بے حال ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔ابا جی آ گئے انجم ڈاکٹر کو بلا لایا۔۔۔۔۔۔۔نازو پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔۔۔۔۔۔۔کبھی بے ہوش ہو جاتی کبھی چیخنے چلانے لگتی۔

ڈاکٹر نے سونے کے لیے انجکشن دیا۔ سکون کے لیے گولیاں دیں۔ نازو بے سدھ ہو کر پڑ گئی۔

صبح ہوش میں آئی تو خاصی کمزوری محسوس کر رہی تھی۔

بڑی بھابی اور امی نے سنا تو اس کی خبر گیری کو آ گئیں۔ چند دنوں کے لیے اپنے ہاں لے گئیں وہاں بھی سکون کہاں تھا۔ دن کا چین لٹ گیا تھا۔ رات کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ جب تک ویلیم نہ کھاتی سو نہ پاتی کئی دن اس کی یہی حالت رہی۔ ڈاکٹر نے ہی ویلیم تجویز کی تھی۔ لیکن جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ ویلیم فائیو کی بجائے ویلیم ٹین لینے لگی تھی۔

نازو کو قرار کہیں نہیں تھا۔ وہ پھر گھر آ گئی سنبل جا چکی تھی۔ یہ گھر امی کے مرنے سے کچھ اور بھی سونا ہو گیا تھا۔ نازو کو یہ گھر تو گھر لگتا ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا کہ یہ گھر نہیں جزائر انڈمان کا وہ حصہ ہے جہاں کبھی عمر قید کاٹنے والوں کو۔۔۔۔۔۔۔ بھیجا جاتا تھا۔

خرم کے لمبے لمبے محبت بھرے خط بھی اب اس کی تسکین نہ دیتے تھے۔ بے یقینی کی کیفیت اس کے اعصاب پر ہر وقت سوار رہتی۔ یہ محبت بھرے خطوط فراڈ لگتے خود غرضی کی دستاویز نظر آتے۔ اس دن بھی خرم کا خط آیا۔ تو رمل آ گئی۔ ''کیا لکھا ہے بھیا نے۔''

اس نے پیار سے پوچھا۔ نازو غصہ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''لکھا ہے بہت جلد ایک خطیر رقم بھیج رہا ہوں۔''

بھابی رمل کو برا لگا۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

نازو کسی کا دل بھی تو نہ دکھا سکتی تھی۔ وہ رمل کے گلے میں بانہیں ڈال کر رو دی ''میری اچھی بہن مت رو میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ میرے جذبات کو تم جان نہیں پاؤ گی۔ اللہ کرے تمہاری شادی بھی کسی ایسی جگہ ہو جہاں تمہارا دولہا تمہیں غیر معینہ مدت کے لیے سسرال کے قید خانے میں بند کر جائے' پھر' پھر۔۔۔۔۔۔۔'' نازو پر ڈپریشن طاری ہو گئی۔ اس نے اٹھ کر الماری سے گولی نکالی اور پانی کے گھونٹ سے نگل کر بیڈ پر آن گری۔

''بھابی!'' رمل نے پوچھا۔ ''آپ دن میں بھی ویلیم کھانے لگی ہیں۔''

''تو کیا کروں؟''

''عادی ہو جائیں گی' مت کھایا کیجئے۔''

نازو ہنس پڑی ''یہی تو مونس و غمگسار ہیں' بھلا دیتی ہیں سب کچھ۔۔۔۔۔۔۔ سب کچھ۔۔۔۔۔۔۔''

دوسرا سال بھی گزر گیا۔ اس دفعہ تو خرم آ ہی نہیں سکا۔ پچھلے سال امی کے مرنے پر جو چھٹی لی تھی' وہ اس سال کٹ گئی۔ خطوں میں اب اگلے سال آنے کی باتیں ہونے لگیں۔

نازو بے حد حساس تھی۔۔۔۔۔۔۔ ذرا ذرا سی بات بھی شدت سے محسوس کرتی تھی۔ یہ تو بہت بڑا سانحہ تھا ویلیم سے اب سکون

نہیں ملتا تھا۔ نازو نے زیادہ اسٹرانگ گولیاں کھانا شروع کر دیں۔

یہ سال بھی اس نے جیتے مرتے گزارا۔ خرم نے ان دو سالوں میں ڈھیروں روپیہ بھیجا تھا۔ جس سے رمل کی شادی کے لیے ضروری اور غیر ضروری اشیاء خریدی گئی تھیں۔ بے دریغ روپیہ خرچ کیا جا رہا تھا۔ نازو بالکل دخل نہیں دیتی تھی۔ وہ تو اب گولیوں سے پرسکون ہو جاتی تھی۔ دماغ ماؤف ماؤف سا رہنے لگا تھا۔ جسم ٹوٹتا رہتا۔ وہ اپنی ذات تک ہی محدود ہو گئی۔ اردگرد کیا ہوتا ہے۔ وہ کم ہی توجہ دیتی۔

انہی دنوں اس کی ملاقات بیگم ریحانہ اظہر سے ہوئی۔ وہ مقامی کلب کی کرتا دھرتا تھیں انہوں نے نازو سے کلب جوائن کرنے کو کہا۔ ''تم جیسی اور بھی لڑکیاں آتی ہیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ اپنی کہتی اور دوسروں کی سنتی ہیں۔ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔''

''ابا جی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔۔ امید ہے وہ تمہیں اجازت دے دیں گے عورتوں کا کلب ہے۔ ہفتے میں دو تین دن تو بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ فلمیں دیکھتے ہیں' گیمز کھیلتے ہیں اور پارٹیاں دیتے ہیں۔ سچی۔۔۔۔۔۔۔ تم مشغول ہو جاؤ گی۔''

نازو واقعی مشغول ہو گئی۔ کلب کی ممبر اسی جیسی عورتیں تھیں۔ جو شوہروں سے دور تھیں۔ کسی کا ایک بچہ تھا' کسی کے دو۔۔۔۔۔۔۔ شوہر پیسہ بنانے کی مشین بنے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ کوئی ماں باپ کی حالت سنوارنے کے لیے پردیس کی خاک چھان رہا تھا۔ کوئی بیوی بچوں کے لیے خون پسینہ ایک کر رہا تھا۔ اس پیسے نے اسٹینڈرڈ بلند کر دیئے تھے۔ ان سب گھروں میں قیمتی اشیاء کی بھرمار تھی۔ نہیں تھا تو شوہروں سے بچھڑی بیویوں کے دلوں میں سکون نہیں تھا۔

لیکن نہیں۔۔۔۔۔۔۔

بیگم ریحانہ اظہر نے انہیں حالات کی تلخی کو بھلا کر عارضی سکون مہیا کرنے کا بندوبست ضرور کر دیا تھا۔ مارفیا کے انجکشن' کوکین اور ہیروئن جیسی چیزیں وہ بڑی ہمدردی اور محبت سے ان کے اندر اتار کر انہیں دوریوں کا احساس مٹانے میں مدد دے رہی تھیں۔

◆◆◆

سنہرے خواب

عمر تو اس کی تیس سال کے لگ بھگ تھی لیکن لگتی وہ پینتیس چھتیس سال کی تھی۔ اس کی وجہ اس کا بے ڈول جسم اور معمولی نقش ونگار کا چہرہ تھا۔ اپنے اس بے ڈھبے پن سے اسے آگہی تھی۔ اس لیے چہرہ ملائمت اور شگفتگی سے عاری تھا۔ بھونڈے اور بدصورت چہروں پر بھی اندر کا سکون اور اطمینان اثر انداز ہو تو ان پر غیر محسوس سا نکھار آجاتا ہے۔ جوان بھونڈے پن اور بدصورتی پر ملائمت اور شگفتگی کی چھاپ لگا دیتا ہے۔ پھر وہ چہرے کچھ کچھ اچھے لگنے لگتے ہیں۔ انہیں بھونڈا اور بدصورت نہیں کہا جا سکتا۔ قبول صورتی کے زمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

سویرا کے معاملے میں یہ بات بھی نہیں تھی۔ اس کے اندر سکون تھا نہ اطمینان' اپنی جسمانی ساخت اور خامیوں کا اسے شدت سے احساس تھا۔ وہ جانتی تھی اس کا جسم بے ڈھبا ہے۔ اس کے تنگ کندھوں پر سر کا سائز قدرے بڑا ہے۔ اس کی آنکھیں موٹی ہیں لیکن اس میں کوئی چمک ہے نہ مقناطیسی کشش۔ اس کی ناک موٹی اور بھدی ہے۔ دہانہ باریک ہونٹوں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی چوڑا لگتا ہے۔ آئینے کے سامنے وہ گھنٹوں بیٹھی اپنی انہیں بدصورتیوں کو تک تک کر کڑھا کرتی تھی اور کڑھنے سے جو خیالات اندر ہی اندر کلبلاتے تھے ان کا اثر چہرے پر پڑتا تھا۔ اسی لیے تو کبھی نکھار جیسی چیز اس کے چہرے پر آئی نہ تھی۔ یہ نکھار تو جوانی کے دنوں میں بھی چہرے کی زینت نہیں بنا تھا۔ اب تو عمر نے بھی اپنی چھاپ نقش ونگار پر اتنی تیزی سے لگانا شروع کر دی تھی کہ وہ اپنی عمر سے بھی آگے نکلتی جا رہی تھی۔ چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے بڑے واضح ہو گئے تھے۔ اور بالوں میں کہیں کہیں سفیدی بھی اترنے لگی تھی۔ بالوں کی سفیدی کچھ وراثتی بھی تھی۔ کئی لوگوں کے بالوں میں تو پچاس سال کی عمر کے بعد بھی چاندی کے تار نظر نہیں آتے لیکن سویرا کے خاندان میں یہ سفیدی وقت سے پہلے اترتی تھی۔ اس کی اماں کے بال بھی اسی عمر میں سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ابا پنتالیس سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے۔ ان کے بال بھی کھچڑی تھے۔ بڑے بھیا کی عمر ابھی چالیس کی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ بھی بالوں کو عرصے سے پولی کلر لگا رہے تھے۔

جب سویرا اٹھارہ بیس برس کی تھی تو وہ اپنی شکل وصورت دیکھ کر بہت کڑھا کرتی تھی۔ اچھا نظر آنے کے لیے وہ چیپ چیپ فیش کیا کرتی تھی۔ کبھی بال کاٹ ڈالتی تھی۔ کبھی میک اپ کے پیچھے پڑ جاتی۔ کبھی نئی نئی تراش خراش کے کپڑے بنا بنا کر پہنتی۔ لیکن روپ

نکھار اس پر آتا ہی نہیں تھا۔ اسے بہت غصہ آتا۔ اپنے آپ پر اپنی ماں پر اپنے حالات پر بہن بھائی ٹھیک ٹھاک ہی تھے۔ ایک وہی ایسی تھی۔

جب نا سمجھی تھی۔ تب وہ اکثر ماں سے بھی لڑ پڑتی۔ ''میں ایسی کیوں ہوں۔''

اماں بیچاری کیا جواب دیتی اسے تو وہ پیاری ہی لگتی تھی۔ ممتا کی ایک ہی تو نظر ہوتی ہے پیار کی نظر۔ پھر اسے اپنا نام پر بھی اعتراض ہوتا۔

''اماں یہ سویرا نام کیوں رکھ دیا تھا میرا۔'' وہ پوچھتی۔

''تو صبح سویرے پیدا ہوئی تھی اس لیے۔'' اماں سادگی سے جواب دیتی۔

''دیکھا تو ہوتا کہ یہ نام مجھ سے مناسبت رکھتا بھی ہے یا نہیں۔''

''مناسبت کا کیا سوال' نام نام ہی ہے۔ جو چاہے رکھ لو۔''

''اماں نام اور شخصیت میں ہم آہنگی ہونی چاہیے' میری طرف دیکھو' سویرا کی بجائے شام لگتی ہوں۔''

''چل ہٹ' تجھے تو ہمیشہ الٹی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔''

''میں خوب گوری چٹی ہوتی نا تو پھر بھی یہ نام جچ جاتا۔''

''اچھی خاصی گوری چٹی تھی بچپن میں۔ اب ہی تجھے کچھ ہوتا جا رہا ہے۔ رنگ ویسا رہا ہی نہیں' پڑھائی ختم کرے گی تو پھر رنگ ویسا ہی نکھر جائے گا۔ دن رات کتابوں میں جھکی رہتی ہے۔ محنت کرنا پڑتی ہے۔ رنگ پر اثر پڑتا ہے۔''

وہ اماں کی سوچ پر ہنس دیا کرتی۔

ویسے پڑھائی لکھائی کی طرف اس کا دھیان زیادہ ہی تھا۔ اس نے میٹرک امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ایف اے میں بھی فسٹ ڈویژن لی۔ اماں نے تو ایف اے کے بعد پڑھائی کو خیر باد کہنے کو کہا تھا۔ لیکن وہ نہیں مانی تھی۔ بڑے بھیا نے بھی ساتھ دیا تھا اور اس نے بی اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ اپنی بدصورتی پر علم کا پردہ ڈال دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے سارا وقت کتابوں میں سر کھپاتی رہتی تھی۔ ظاہری حسن سے محروم تھی تو کیا ہوا علم کی روشنی سے وہ اپنا دل و دماغ منور کر کے اپنا ذہن پر نور بنانا چاہتی تھی۔''

عمر اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ سنجیدہ ہوتی گئی۔ شکل وصورت اور جسمانی بے ڈھبے پن کی خامی اپنی جگہ سہی لیکن اب اس نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ جیسی تھی بس تھی۔ اس کے سوچنے اور کڑھنے سے کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔

بی اے کے بعد اس نے ایم اے میں داخلہ لینا چاہا۔لیکن بڑے بھیا کے مالی حالات اس بات کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ان کے اپنے چھ بچے تھے۔تنخواہ گزر بسر ہی کے لیے تھی' بمشکل یہ کشتی کھینچ رہے تھے۔اماں کے بعد سویرا کا سارا بار بھی انہی پر آن پڑا تھا۔سویرا نے ایم اے کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

لیکن

وہ بیکار گھر پر بھی نہ بیٹھ سکتی تھی۔گھریلو کاموں کا اسے شوق تھا نہ تجربہ۔شروع ہی سے بھابی نے چولہا سنبھالا ہوا تھا۔اماں کے ہوتے ہوئے بھی سارے کام وہی کرتی تھیں اور اب بھی۔۔۔۔۔۔۔سویرا سے نہ کبھی پہلے کام کروایا تھا نہ اب۔

''میں نوکری کروں گی۔''ایک دن اس نے بڑے بھیا سے کہا۔

''نوکری''

''ہاں''

''لیکن نوکری ملے گی کیسے! سکولوں میں تو ان ٹرینڈ کو لیتے ہی نہیں۔''

''سکول کی نوکری ضروری تھوڑا ہی ہے۔''

''تو پھر؟''

''کہیں کسی دفتر میں کسی بنک میں' بی اے فسٹ کلاس ہوں۔''

''وہ تو ہو۔''

''پھر آپ کوشش کریں نا۔''

''ہوں''

''خالی ہوں نہیں بھیا' مجھے نوکری دلانا ہے آپ نے۔میں بیکار گھر نہیں بیٹھ سکتی۔''

وہ نوکری کے متعلق سنجیدہ ہو گئی۔اس نے اپنی دو تین سہیلیوں سے بھی کہہ دیا ان کے باپ اچھے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔

بھابی نے دبے لفظوں میں نوکری کی مخالفت کی۔ماں باپ کے مرنے کے بعد سویرا ان کی ذمہ داری تھی۔

''نوکری ڈھونڈنے سے بہتر ہوگا کہ اس کے لیے رشتہ تلاش کیا جائے۔''بھابی نے ایک دن بھیا سے کہا۔

''کہتی تو ٹھیک ہے لیکن۔''

''لیکن کیا۔اول آخر شادی تو کرنا ہی ہے۔یہ ہماری ذمہ داری ہے۔''

''کوئی رشتہ آئے گا تو دیکھیں گے۔''

بھیا اور بھابی کی کھسر پھسر کا سویرا کو علم ہو گیا۔وقتی طور پر تو وہ بھی ہر جوان لڑکی کی طرح رنگین اور حسین خوابوں میں کھو گئی۔گھر بسانے کی خواہش ہر لڑکی کی فطرت کا حصہ ہوتی ہے۔سویرا بھی لڑکی تھی۔جوان اور دھڑکتا دل رکھنے والی لڑکی۔شادی کے خیال سے اس کی آنکھوں میں بھی رنگ اترنے لگے تھے۔

لیکن

گھیر گھار کر لائے جانے والے رشتوں کا اسے اتنا تلخ تجربہ ہوا کہ اس کو شادی کے نام سے خوف آنے لگا۔زبردستی کسی کے سر منڈھے جانے سے بہتر تھا کہ وہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔

سلطان محمد بھابی کا دور پار کا عزیز تھا۔چونگی میں معمولی محرر تھا۔شکل وصورت کا بھی واجبی سا انسان تھا۔عادتیں کچھ اچھی نہ تھیں۔غصے کا تیز تھا۔کنوئیں کا مینڈک' ترقی کرنے کی کوئی امنگ نہ تھی۔بھابی نے جانے کیا کیا بہلاوے دیئے سبز باغ دکھائے سویرا کے حصے میں اماں کا جو چھوڑا ہوا مکان آیا تھا اس کا لالچ دیا۔وہ شادی پر جبراً تیار ہوا۔

لیکن

سویرا نے انکار کر دیا۔وہ چھوٹی بچی نہیں تھی۔سودا بازی نہیں کرنا چاہتی تھی۔اپنی ظاہری بدصورتی کے عوض کسی ناپسندیدہ شخصیت کو اپنانے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔تعلیم نے اسے اچھائی برائی کا شعور تو دے رکھا تھا نا۔

''بھابی'' اس نے اس دن کہہ ہی دیا۔''آپ کے لیے میں بار ضرور ہوں لیکن بار اتارنے کے لیے بھی جگہ کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔پھینکنے سے کام نہیں چلے گا بھابی۔''

''سویرا میں تو تمہارے بھلے ہی کا سوچتی ہوں۔''

''سلطان محمد کی ساری خامیاں جانتے ہوئے بھی میرے بھلے کا سوچنے کی بات کر سکتی ہیں۔''

''مجبوری ہے۔''

''شادی اتنی ضروری بھی نہیں۔آپ سارے تفکرات ذہن سے نکال دیں۔جب کوئی مناسب ہاتھ میری طرف اپنی رضامندی سے بڑھے گا۔تو پھر میں معترض نہیں ہوں گی۔فی الحال آپ اس سلسلے میں تردد کرنا چھوڑ دیں۔مجھے نوکری ملنے کی امید بندھ گئی ہے۔

میں اپنا بار خود اپنے کندھوں پر اٹھالوں گی۔ اور آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں اپنے آپ سے آگاہ ہوں۔ شادی نہ بھی ہوئی تو زندگی سے نبھاہ کرلوں گی۔"

"ایسی مایوسی کی بھی بات نہیں۔ اپنے بارے میں تمہاری سوچ منفی ہے۔ اسی لیے۔"

"بھابی" اس نے مسکراتے ہوئے بھابی کی بات کاٹ دی۔ "میں جیسی ہوں جو کچھ ہوں مجھے پتہ ہے' عام طور پر لوگ ظاہری شکل و صورت ہی دیکھتے ہیں۔ اس لیے میری شادی کا امکان نہ ہونے ہی کے برابر ہے۔ ہاں' کبھی کوئی پرکھنے والی نظر میرے اندر اتر کر دیکھ سکے تو شاید میرے ذہن کی خوبصورتی اسے متاثر کردے اور وہ۔"

"خیر' تو جو کچھ بھی کہتی رہ' مگر میں اپنی کوشش جاری رکھوں گی۔"

"خوشی سے جاری رکھیں بھابی لیکن یہ بات نہ بھولئے گا کہ میں اپنی خامیوں کی بنا پر کوئی سودے بازی کرلوں گی' ٹھیک"

"ٹھیک"

شادی کا مسئلہ مسئلہ ہی رہا' سویرا کو ملازمت مل گئی' وہ سنجیدگی سے کام کرنے لگی۔ مردوں کے ساتھ کام کرنے میں پہلے پہل اسے کچھ مشکلات پیش آئیں' وہ لڑکی تھی۔ خوبصورت نہ سہی جوان تو تھی' کئی گرسنہ نظریں اس پر پڑیں' دو ایک من چلے تو اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش بھی کرنے لگے' لیکن۔

اس نے اپنا آپ بہت احتیاط سے سمیٹ لیا۔ صرف اور صرف کام سے غرض رکھی۔ کسی کی گرسنہ اور اشتہاء آمیز نظروں پر دھیان دیا نہ ہی فلرٹ کرنے والوں کو کامیابی کا موقع فراہم کیا۔ اس کی سنگین خاموشی سے سب کو مایوسی ہوئی۔

چند مہینوں ہی میں اس نے اپنا مقام بنالیا اور وہ دفتر میں ایک جوان لڑکی نہیں ایک فعال اور ذمہ دار مشین کے طور پر پہچانی جانے لگی۔

وہ وقت پر دفتر پہنچتی۔

دیانت داری سے کام کرتی۔

ضرورت ہوتی تو کسی سے بات کرلیتی۔

مناسب سمجھتی تو کسی کی بات کا جواب دے دیتی۔

فارغ وقت کینٹین میں چائے پیتے گزارتی اور۔

چھٹی ہوتے ہی دفتر کی عمارت سے باہر نکل کر رکشے کے انتظار میں کھڑی ہو جاتی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا اور اس۔
معمولی کے خول میں لپٹی وہ بڑی کامیابی سے شاہراہ زندگی پر قدم بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ بالکل مشینی اور مکینکی انداز میں لیکن۔
کبھی کبھی مشینی خول کے اندر جیتی جاگتی اور دھڑکتی جسمانی اور روحانی ضرورتوں کے لیے بھی بے چین ہو جاتی۔ اس کا جی بھی چاہتا کہ کوئی اس کا جیون ساتھی ہو۔ اسے شکل وصورت کے حوالے سے نہیں اس کے روشن دل ودماغ اور خوبصورت ذہن کے ناطے سے قبول کر لے۔ اسے اپنا لے۔ تحفظ کا احساس دے۔ اس پر خوشیوں کی پھوار برسائے اسے تسکین وطمانیت کی دولت سے مالا مال کر دے اس کے دکھ سکھ کا شریک ہو۔ اسے گھر دے اور اس گھر میں بچوں کی مہک پھیل جائے۔ کتنی خوبصورت اور حسین دنیا کا تصور جاگتا تھا۔ وہ پر یقین ہو جاتی کہ یہ تصور حقیقت کے رنگ میں ضرور ابھرے گا۔ وہ کئی کئی دن مسرور اور شاد ماں نظر آتی۔ لیکن یہ مسرتیں دیرپا نہ ہوتیں۔ مایوسیوں کے ناگ انہیں ڈس لیتے۔ کوئی ہاتھ اس کی طرف نہ بڑھتا۔ کوئی نظر اس کے اندر نہ اترتی۔

سودے بازی کی وہ مخالف تھی۔

ہمدردی سے اسے نفرت تھی۔

وہ تو اپنے عورت ہونے کا باوقار حق چاہتی تھی۔

جو اسے مل نہیں رہا تھا۔

بھابی کے ملنے والوں کی وساطت سے دو ایک رشتے اب بھی آئے تھے۔ ایک تو رنڈوا تھا۔ اس نے شکل وصورت کی کوئی قید نہیں لگائی تھی۔ اسے اپنے بن ماں کے تین بچوں کے لیے ایک ایسی ہی عورت کی ضرورت تھی۔ جو اپنی خامی کی بنا پر دبی رہے اور اس کے بچوں کی خدمت اور نگہداشت کرتی رہے۔

دوسرا رشتہ بھی ایک معمر آدمی کا تھا۔ جو از راہ ہمدردی شادی پر تیار ہوا تھا' سویرا کی امی کا دور پار کا عزیز تھا۔ برسوں دیار غیر میں رہنے کے بعد امریکن بیوی سے طلاق پا کر واپس لوٹا تھا۔ شادی اسے کرنا ہی تھی وہاں سویرا کو بھی تحفظ ملتا تھا۔ اس رشتے کے لیے تو بھابی نے ہی نہیں بھیا نے بھی زور لگایا۔ بہت سمجھایا بجھایا۔

لیکن

وہ راضی نہیں ہوئی۔

پرکھ اور پسند کا معیار اس کا اپنا تھا۔ شخصیت کی ارزانی اسے کسی طور گوارہ نہ تھی۔ سویرا مان جاؤ۔ وقت نکل جائے تو پچھتاوے کے

سوا کچھ باقی نہیں آتا۔ اسے اپنی خوش بختی سمجھو کہ تمہارے لیے ہاتھ بڑھائے جا رہے ہیں۔ تم حالات سے بے خبر تو نہیں ہوئی اور اب ناسمجھ بھی نہیں۔ عمر بیتی جا رہی ہے۔ دو چار سال اور گزر گئے تو کوئی ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔

بھابی کی باتیں وہ سنی ان سنی کر دیتی۔ کبھی چپ رہتی کبھی ہنس پڑتی اور کبھی برا مان جاتی۔ اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ اچھا خاصا کما لیتی تھی۔ اپنا تو کیا بھائی کا بوجھ بھی بانٹ رہی تھی۔ بھائی کے دونوں بڑے بچوں کے تعلیمی اخراجات اس نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔

شادی کے متعلق بھی وہ سوچتی ضرور تھی۔ گھر بسانے کی امنگ اس کے دل میں بھی تھی۔ چہکتے مہکتے بچے اس کے ذہن میں بھی گلکاریاں مارتے رہتے تھے۔ لیکن اپنی ساری جسمانی خامیوں کے باوجود اسے خوب سے خوب تر کی تلاش لاشعوری طور پر ضرور تھی۔ جیون ساتھی ایسا تو ہو جس سے خیالات کی ہم آہنگی ہو۔ جو اس کے اندر کی خوبصورتی کو دیکھ پرکھ سکے۔ جو شوہرانہ حاکمیت کی بجائے دوستانہ رویے اپنائے۔

وقت ایسے ہی بیتے جا رہا تھا۔ سویرا عمر کے تیسویں سال میں داخل ہو گئی تھی۔ نوکری کرتے بھی دس گیارہ سال ہو چکے تھے۔ اب وہ اچھی خاصی پختہ عمر کی عورت لگتی تھی۔ تاحال اسے ایسا کوئی انسان نہیں ملا تھا۔ جو اس کی شخصیت کے کسی ایک پہلو سے بھی متاثر ہوا ہو۔ کئی مرد ملے تھے۔ لیکن کسی نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ مایوسی کا دکھ اس کے اندر رینگ رہا تھا اور اس کا پرتو اس کے چہرے پر بھی پڑ رہا تھا۔ اسی لیے تو وہ تیس سال کی ہوتے ہوئے بھی پینتیس چھتیس سال سے کم کی نہ لگتی تھی۔

انہیں دنوں اس کی پوسٹنگ ہیڈ آفس میں ہو گئی۔ اسے ترقی ملی تھی۔ وہ خوش بھی تھی لیکن نئی جگہ اور نئے لوگوں میں جانے کا ایک غیر محسوس سا خوف بھی دامن گیر تھا۔ شروع شروع میں جو ذہنی کوفتیں اس نے اٹھائی تھیں۔ لگتا تھا اب پھر سے ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس کا تجربہ اسے پہلے ہی ہو گیا۔

وہ جس سیٹ پر آئی تھی۔ اس پر بیٹھنے والی خاتون شاید خوبصورت' سمارٹ اور خوش لباس تھی۔ تبھی تو اس پر پہلا آوازہ کسا گیا۔

''سیٹ کو گرہن لگ گیا ہے۔ چاند جو چلا گیا۔''

کسی دوسری سمت سے کسی نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں' ہے تو سویرا۔''

کسی تیسرے نے کہا۔ ''لیکن بالکل اندھیرا۔''

اس پر اک قہقہہ پڑا۔

سویرا نے گھبرا کر بیچارگی سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نکلنے سے پہلے اس کے دائیں ہاتھ کی سیٹ پر بیٹھا اٹھائیس تیس سالہ ضیا سیٹ سے اٹھ کر ان لوگوں پر جھپٹ پڑا۔ جو سویرا پر یوں آوازیں کس رہے تھے۔

ایک لمحہ کو تو سویرا اور آوازے کسنے والوں کو بھی پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔ ضیا نے حامد کے دو تین چانٹے جڑ دیئے۔ رفیق کی گردن پکڑ لی اور غلام احمد کے اوپر پل پڑا۔

''شرم نہیں آتی تم سب کو ایک خاتون پر یوں آوازے کس رہے ہو۔ گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں۔ اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ آج ہی یہاں آئی ہیں۔ تم لوگوں کو تمیز ہی نہیں۔ ان کا استقبال اس طرح کر رہے ہو۔ شرم سے ڈوب مرو۔''

ضیا کی حمایت میں کچھ اور لوگ بھی بولنے لگے۔ تینوں من چلے نوجوان شرمندہ ہو گئے۔ ضیا کی حمایت دفتر کا باقی عملہ نہ کرتا تو شاید یہ بگڑے نوجوان ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ لیکن اب وہ خود ہی خفت سے دوچار تھے۔

''مس سویرا ملک'' ضیا ان سے نپٹ کر اس کی طرف آیا۔

وہ روہانسی بیٹھی تھی۔

''آپ کو یہاں آتے ہی اس تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ مجھے بہت افسوس ہے لیکن گھبرایئے گا نہیں ان کو میں نے سبق سکھا دیا ہے۔ شرافت کی ذرا بھی رمق ان میں ہوئی تو آئندہ یہ آنکھ اٹھا کر بھی آپ کی طرف نہیں دیکھیں گے۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ مسٹر۔''

''ضیاء شیخ۔۔۔۔۔۔۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اپنے آپ کو نہ ہی غیر محفوظ سمجھیں۔ میرے ہوتے ہوئے اب کوئی آپ سے کچھ کہنے کی جرات نہیں کر سکے گا۔''

سویرا نے نگاہیں اٹھا کر ڈیسک کے دوسری طرف کھڑے ضیا کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا خوبرو صحت مند اور مضبوط جسم کا جوان آدمی تھا۔

''کیا یہ وہی نہیں جس کی کھوج میں اس نے اپنی جوانی کے کئی سال بتا دیئے ہیں'' سویرا کے اندر سے آواز اٹھ رہی تھی۔

''ہاں یہ وہی ہے۔۔۔۔۔۔۔ وہی ہے۔'' اک شور سا مچ گیا۔

ضیا اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ ہال میں بپا ہونے والا ہنگامہ فرو ہو گیا تھا۔ خفت کے مارے نوجوان اب سر جھکائے فائلوں کو دیکھ رہے تھے۔ باقی لوگ بھی کام میں مصروف ہو گئے تھے۔

باس بھی آچکا تھا۔

اور

اس نے سویرا کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔

اٹھ کر اندر جانے سے پہلے سویرا کی نظر ارادی طور پر ضیا کی طرف اٹھی تھی۔ ضیا نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر اس کی ہمت بندھائی تھی۔۔۔۔۔۔۔ جیسے کہا ہو۔

''بے دھڑک چلی جاؤ۔ میں ہوں یہاں۔''

سویرا کے من میں پھول مہک اٹھے تھے۔''

اور

جب چھٹی ہوئی تھی تو ضیا کے ساتھ ساتھ وہ ہال سے باہر آئی تھی۔

''آپ گھر کیسے جائیں گی۔'' اس نے دفتر کی عمارت سے نکل کر فٹ پاتھ پر آتے ہوئے پوچھا۔

''رکشے سے۔'' سویرا نے جواب دیا۔

دور ہے گھر آپ کا۔''

سویرا نے اسے بتایا کہ وہ کس علاقے میں رہتی ہے۔

''بس بھی جاتی ہے ادھر۔''

''ابھی مجھے روٹ کا صحیح پتہ نہیں۔''

''میں پتہ کروں گا۔''

''شکریہ مسٹر شیخ!''

''کوئی بات نہیں مس ملک' یہ تو میرا اخلاقی فرض ہے۔ ہم ایک دفتر میں کام کرنے والے ہیں۔ ہمیں تو ایک کنبے کی طرح مل جل کر رہنا ہوتا ہے۔ مجھے آج کے واقعے سے سخت افسوس اور ندامت ہو رہی ہے۔ ان لوگوں نے آپ کے ساتھ اتنی بدتمیزی کی۔''

''میں آپ کی بے حد ممنون ہوں۔''

رکشہ فٹ پاتھ کے قریب آن رکا۔

ضیا نے ہی اس سے پیسے طے کئے۔ میٹر پر وہ ادھر جانے پر تیار تھا۔

''شکریہ'' سویرا نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔

''خدا حافظ'' ضیا نے کہا اور اپنے سکوٹر کی طرف چل دیا۔

ضیا سویرا کی زندگی میں نیا سویرا بن کر اترا۔ ہر سو بے داغ اجالے سے پھیلتے محسوس ہوئے۔ زندگی پر چھائی برسوں کی کہر چھٹ گئی۔ قدموں نے وہ سمت تلاش کر لی جس طرف منزل تھی۔ آنکھوں کو وہ جہت نظر آ گئی جسے دیکھنے کے لیے اس نے برسوں کا چلہ کاٹا تھا۔

اس دن وہ ہنستی مسکراتی گھر پہنچی۔ اس کی من کی خاموشی گنگنا رہی تھی۔

''اے کیا بات ہے بہت خوش ہے آج۔'' بھابی نے پوچھا۔ ''لگتا ہے نیا دفتر پسند آ گیا۔''

''بہت'' وہ اترائی۔

''اچھی بات ہے۔ کولیگ اچھے ہوں تو وقت اچھا گزرتا ہے۔''

''زندگی بھی تو اچھی گزر سکتی ہے بھابی۔'' اس نے پرس جھلاتے ہوئے کہا۔ بھابی اصل بات تو سمجھی نہیں۔ ہاں دعائیہ انداز میں بولی۔ ''خدا کرے تیری زندگی اچھی گزرے۔''

سویرا نے اس رات بڑے سہانے خواب دیکھے۔ جاگتے میں بھی سوتے میں بھی ضیا کی شخصیت اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ ایسے ہی تو کوئی کسی کی طرف داری نہیں کرنے لگتا۔ ایسے ہی تو کسی کو کوئی تحفظ کا احساس نہیں دلاتا۔ ایسے ہی تو کوئی مدد کرنے نہیں لپکتا۔ ضیا نے اس کے لیے رکشے والے سے بھی پیسے طے کئے تھے اور بس روٹ کا پتہ کرنے کی بھی ذمہ داری لی تھی۔

کیوں؟

آخر کیوں؟

اس کیوں کا جواب اتنا حسین اتنا سحر انگیز تھا کہ سویرا کو اپنے متعلق غلط فہمی سی ہونے لگی۔ آج تک جو ذہن میں اپنی بدصورتی کا کربناک احساس ناگ کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ وہ اس پل میں جاتا رہا۔

وہ بڑی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی اپنے سراپا کا جائزہ لیتی رہی۔ اپنے خدوخال کو دیکھتی رہی۔ اپنی رنگت کو جانچتی رہی۔ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ لیکن من کبھی کبھی بہلاوؤں میں آ کر ضرور جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ سویرا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ آئینے سے

نظریں چرا کر وہ اپنے من کے آئینوں میں اپنے آپ کو تکنے لگی تھی۔ من جو پاکیزہ تھا۔ خوبصورت تھا۔ بے داغ تھا۔

یقیناً ضیا کی نظر اس کے من کے اندر اتر گئی تھی۔ اس نظر نے طہارت اور پاکیزگی کو پہچان لیا تھا۔

دوسرے دن سویرا دفتر پہنچی تو نچلی منزل کی سیڑھیوں پر ہی ضیا مل گیا۔ سویرا دل کی مقناطیسی کشش کو قائل ہو گئی۔

ضیا نے اسے دیکھا تو اسی سیڑھی پر رک کر سر گھمایا۔ دو سیڑھیاں پیچھے آنے والی سویرا کو بڑے تپاک سے سلام کیا۔

سویرا نے سلام کا جواب دیا۔

وہ اس کے برابر سیڑھی پر آ گئی تو ضیا بولا۔ ''ابھی رکشے سے آئی ہیں سویرا ملک۔''

''جی'' وہ اگلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے بولی۔

''میں نے بس روٹ کا پتہ کیا ہے۔'' وہ بھی برابر قدم بڑھاتے رہے۔

''میرے لیے؟'' وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔

''جی' کل میں نے کہا تھا نا بس روٹ کا پتہ کروں گا۔ آپ کے علاقے کی طرف یہاں سے دائریکٹ بس نہیں جاتی۔''

''اچھا''

''ایک جگہ بدلنا پڑے گی۔ یہاں سے جو بس جاتی ہے۔ وہ چھاؤنی کے علاقے کی طرف جاتی ہے لیکن ریگل چوک پر اتر کر آپ کے گھر کی طرف جانے والی بس پکڑی جا سکتی ہے۔''

''ہوں''

''کوئی زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔'' اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟''

''نقشہ''

''نقشہ۔۔۔۔۔۔۔۔؟''

''جی ہاں' یہ دیکھیں' یہاں سے آدھے فرلانگ پر بس سٹاپ ہے۔'' اس نے کاغذ پر بنے نقشے پر انگلی رکھی۔ نقشہ سویرا کے ہاتھوں میں تھا۔ دونوں دوسری منزل کے ٹیرس پر آ گئے تھے۔ اوپر جانے والے لوگ ادھر سے گزر رہے تھے۔ نیچے بھی جا آ رہے تھے۔ وہ دونوں ایک طرف ہو کر رک گئے۔ ضیا اسے بسوں کے نمبر بتا رہا تھا۔ جو اس بس سٹاپ سے ریگل چوک رکتی تھی اور پھر ریگل چوک سے

اس کے علاقے کی طرف جانے والی بسوں کے نمبر بھی اس نے نوٹ کر لیے تھے۔ وہ بھی اسے سمجھا رہا تھا۔

''آپ کو بس سے آنے جانے میں آسانی رہے گی۔ رکشے پہ آتی جاتی رہیں' تو تنخواہ کا بیشتر حصہ گل ہو جائے گا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ سویرا نے اس کی مسکراہٹ راہوں میں پھیلی روشنی کی طرح لگی۔

''راستہ سمجھ گئی ہیں نا؟''

''جی' تکلیف کے لیے بہت بہت شکریہ مسٹر ضیا۔''

''تکلیف کیسی' مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسکا۔''

''اس دنیا میں آپ جیسے لوگ بھی ہیں۔''

وہ ہنس کر بولا۔ ''اتنا مان نہ دیں مس ملک! میں تو اک ناچیز سا بندہ ہوں۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے ہال میں داخل ہو گئے۔

پتہ نہیں ضیا سے دھڑکا تھا یا سویرا ہی کی سنجیدگی' بہر حال اس دن کے بعد کسی آوارہ اور من چلے نوجوان کو اس پر آوازے کسنے کی جرات نہ ہوئی' دفتر کے دوسرے لوگوں نے بھی سویرا کو تعظیم دی۔ مل جل کر ایک کنبے کے افراد کی طرح رہنے کا احساس دیا۔ ضیا اور سویرا کی بے تکلفی کو بھی کوئی رنگ نہ دیا نہ ہی اچھالا۔

سویرا ضیا سے سینئر تھی۔ وہ کام میں اس کی مدد کرتی تھی۔ دونوں ایک فائل پر کئی بار جھکے قلم چلاتے۔ سویرا ضیا کی سیٹ پر دن میں دو ایک بار آ کر ضرور کوئی نہ کوئی بات کرتی۔ ضیا اس کی سیٹ پر آ جاتا۔ دونوں چھٹی کے وقت اکٹھے ہی باہر نکلتے۔ کینٹین میں چائے پینے چلے جاتے۔ سویرا کسی دن گھر سے کھانا لے کر آتی۔ تو ضیا کو ضرور کھلاتی۔

اس دن بھی وہ قیمے کے پراٹھے پکوا کر لائی تھی۔

دونوں کینٹین میں بیٹھے تھے۔ گرم گرم چائے منگوائی تھی۔ پراٹھے بھی گرم کروائے تھے۔ اب دونوں کیچ اپ کے ساتھ کرارے پراٹھے کھا رہے تھے۔

''بہت مزے دار ہیں۔'' ضیا نے کہا۔ ''آپ نے بنائے ہیں۔''

''میں کھانا پکانے کے معاملے میں کوری ہوں مسٹر ضیا۔ بھابی نے بنا کر دیئے ہیں۔''

''خوش قسمت ہیں آپ مس ملک۔ جو بھابی اتنے اچھے پراٹھے بنا دیتی ہے۔ ایک ہماری بھابی ہیں کہ۔''

''کیوں؟'' آپ کی بھابی کو کھانا پکانا نہیں آتا۔''

''آتا ہے لیکن صرف اپنے شوہر اور بچوں کے لیے۔''

''آپ''

''میں اور میری ماں اپنا دانہ دنکا خود چنتے ہیں۔''

ضیا اور سویرا پہلی بار ذاتی قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ ضیا اپنی چالاک ہوشیار اور خود غرض بھابی کی باتیں سناتے ہوئے بولا۔''ہم ماں بیٹا تو بہو کے اس روپ سے اتنا ڈر گئے ہیں کہ بہولانے کے خیال ہی سے خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے۔

سویرا نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ ضیا نے ابھی تک کسی سے رشتہ نہیں جوڑا۔ وہ ہولے سے بولی۔''ڈرنے کی کیا بات ہے' ہر لڑکی ایک جیسی تھوڑا ہی ہوتی ہے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا کیا جائے' دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔''

سویرا مسکرانے لگی۔

اس رات بھی سویرا نے بڑے محسور کن خواب دیکھے۔

اور

اس دن تو یہ خواب اور بھی نکھر آئے۔ جس دن ضیا نے سویرا سے کہا۔''کسی دن ہمارے ہاں آیئے نا میں آپ کو اپنی امی سے ملواؤں۔ امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ شاید آپ ان کا مسئلہ حل کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوں۔''

سویرا کے من میں پھلجھڑیاں پھوٹنے لگی تھیں۔ زندگی میں اتنا حسن در آیا تھا' اتنی خیرہ کن چمک بھر گئی تھی کہ اس سے سنبھل نہیں پا رہی تھی۔''

اس نے تو ضیا سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ ماں کے کس مسئلے کی بات کر رہا ہے۔ اور اس کا مددگار ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

سب باتیں وضاحتوں کی مرہون منت تو نہیں ہوتیں نا۔ اشارے آخر کس لیے ہوتے ہیں۔ خود بخود سمجھ نہ آ جائیں تو ان کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

اور

اس دن جب وہ کینٹین میں میز پر آمنے سامنے بیٹھے چائے پیتے ہوئے گھر آنے کے لیے وقت اور دن کا تعین کر رہے تھے۔

ضیا نے پوچھا۔ ''اس جمعہ کو آپ فارغ ہوں گی۔''

''ہاں، میں جمعہ گھر پر ہی گزارتی ہوں۔ میرا بھی آپ کی طرح کچھ زیادہ لوگوں سے ملنا جلنا ہے ہی نہیں مسٹر ضیا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے مس ملک۔'' ضیا نے کہا پھر پیالی واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے ہولے سے ہنسا۔

سویرا نے اس کی طرف دیکھا۔

''ایک بات کہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''جی کہئے۔'' ان کہی بات کے کہہ دینے کا خوف سویرا کو کپکپا گیا۔

''برا نہیں مانیں گی نا؟''

''کس بات کا؟''

''اس بات کا کہ جب ہم دونوں خاصے بے تکلف ہیں، تو پھر القاب و خطاب میں تکلف کیوں برتتے ہیں۔''

''جی'' تیس سالہ سویرا کا دل پندرہ سالہ الہڑ لڑکی کی طرح دھک دھک کرنے لگا۔

''آپ مجھے مسٹر ضیا یا مسٹر شیخ کی بجائے صرف ضیا کہا کریں۔''

سویرا کے لبوں پر مسکراہٹ جی اٹھی۔ پیار آنکھوں میں سمٹ آیا۔ بڑی بھرپور نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے۔''

''اور'' وہ چند لمحے ہچکچانے کے بعد بولا۔

''اور؟''

''اور میں آپ کو مس ملک یا مس سویرا ملک کی بجائے باجی کہہ دیا کروں تو۔''

سویرا کو یوں لگا جیسے کسی انجانی سمت سے توپ کا گولہ سیدھا اس کے دل پر آن کر گرا ہے۔ ایک لمحہ کو تو وہ تیورائی اور اس طرح بوکھلائی کہ اس کے منہ سے اف تک بھی نہ نکل سکا۔

ضیا اس کی ذہنی کیفیات سے بے خبر پیالی میں چائے دانی سے چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔ ''میری کوئی بہن نہیں ہے۔ مجھے بہن کی بہت چاہت اور حسرت تھی۔ میں نے پہلے ہی دن آپ پر سے چڑ کر جب ان لڑکوں کو مارا پیٹا تھا اسی دن میرے دل میں آپ کے لیے ایک بھائی کے جذبات جاگ اٹھے تھے۔ میں نے امی کو آپ کے متعلق بتایا تھا۔ وہ بھی میری منہ بولی بہن کو بیٹی بنانا چاہتی ہیں۔ میری شادی کے معاملے میں بہو پر تو وہ کسی طور پر اعتماد نہیں کرتیں۔ آپ بیٹی بنیں گی تو یقیناً ان کا مسئلہ آپ حل کرنے میں ہمدردی سے مدد دیں گی۔''

وہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا۔

لیکن

سویرا کے ذہن میں تو دھڑام دھڑام گرنے والی عمارت کا شور تھا۔

عمارت

جو

اس نے ضیا کے سنگ سنگ زندگی گزارنے کے روپہلے سنہرے تصوروں اور خوبصورت خوابوں سے سجائی بنائی تھی۔

◆◆◆

تاخیر

اس کا جی چاہا کہ بیڈ پر بے ترتیبی سے پڑی اس عورت کو شوٹ کر دے۔ عالم غیظ و غضب میں وہ الماری کی طرف بڑھا ایک جھٹکے سے الماری کا پٹ کھول کر اوپر والے خانے میں پڑا پستول ہاتھ میں پکڑے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ کوئی فیصلہ کن لمحہ اس کے اندر چیخ اٹھا تھا۔ اور وہ ہاتھ میں پستول پکڑے بیڈ پر بے ترتیبی سے پڑی رما کو تکنے لگا تھا۔

رما بے ترتیبی سے بیڈ پر پڑی تھی' فرنچ شیفون ساڑھی جو اس نے اپنے بے حد اسمارٹ جسم پر بڑی خوبصورتی سے سجائی تھی' اب اسی کی طرح بے ترتیب ہو رہی تھی' پلو قالین پر گھسٹنے کے انداز میں لہرا رہا تھا' ساری چنتیں ڈھیلی پڑ کر ایک طرف کو ہو گئی تھیں' گلے میں سفید زنجیر اور اس میں چمکنے والے ڈائمنڈ بھی نیچے لٹک رہے تھے' اس کی ایک ٹانگ بیڈ پر تھی' دوسری نیچے لٹک رہی تھی۔ ایک جوتا جو قالین پر الٹا پڑا تھا' دوسرا پاؤں میں ہی پھنسا ہوا تھا۔ اس کے بازو بھی بے تکے پڑے تھے۔ ایک ہاتھ تکیے پر پڑا تھا اور دوسرا پٹی سے نیچے لٹک رہا تھا' اس کی کلائی میں پڑی نفیس طلائی چوڑیاں اکٹھی ہو گئی تھیں اور اس کی انگلیوں میں پڑی موٹی موٹی ڈائمنڈ اور ایمرلڈ کی انگوٹھیوں پر جھکی آ رہی تھیں۔ اس کے تراشیدہ بال بھی بکھر گئے تھے' کچھ تکیے پر پڑے تھے' کچھ بلوریں اور ڈھلان کندھوں پر بکھرے تھے' اس کے حسین چہرے' خوبصورت گردن اور سڈول کندھوں پر کئی نشان تھے۔

وہ بے سدھ تھی۔ شراب کی بو نے اس کے سراپا کو محیط کیا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر چھڑکی ہوئی پرفیوم میں شراب کی بو مل گئی اور اب ایک ناگوار سی بساند بن کر پھیل رہی تھی۔

کرب و اذیت کی ایک تند لہر اس کے ذہن سے اٹھی اور اس کے دماغ سے ٹکرائی' اس نے سختی سے اپنی آنکھیں میچ لیں' اس کا پستول والا ہاتھ خود بخود نیچے ہو گیا۔ اپنا ماتھا اس نے الماری کے کھلے پٹ سے لگا دیا' اسے یوں لگنے لگا جیسے اس خوبصورت سے سجی خواب گاہ کی دیواریں سمٹ رہی ہیں' چھت اس کے اوپر آ رہی ہے۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے' رما کو گھر میں داخل ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے۔ پندرہ بیس منٹ پہلے جب وہ گاڑی چھوڑ کر اندر آئی تو لہرا رہی تھی' وہ سیدھی اپنے بچے کے کمرے میں آئی تھی' جہاں تپتے تین ساڑھے تین سالہ تابی کو گود میں لیے سجاد بیٹھا تھا۔

تابی کو دو دن سے بخار آ رہا تھا۔ آج شام اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔ رما نے ہمیشہ کی طرح اسے آیا کے رحم و کرم پر چھوڑا ہوا

تھا۔ اپنے معمولات میں بچے کی بیماری کو حائل کرنے کی وہ قائل نہیں تھی۔ اس کی شامیں ہمیشہ کسی کلب یا کسی ہوٹل میں گزرتی تھیں۔ رات گئے تک گھر سے باہر رہنے کی اسے عادت تھی۔ دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا' رنگ رلیاں منانا اور پینا پلانا اس کا شغل تھا۔ وہ نسوانیت کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ عورت کی شرم وحیا اس کے لیے دور جہالت کی علامت تھی۔ گھر' شوہر اور بچوں سے ناتے توڑ کر آزاد نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی جذباتی لگاؤ خاصا ڈھیلا ہو چکا تھا۔ گھر کی ضرورت اسے یوں تھی کہ وہ پناہ گاہ تھا۔ شوہر سے اس کا تعلق اس لیے نہیں ٹوٹا تھا کہ وہ محافظ تھا اور بچوں سے وابستگی قائم تھی کیونکہ اس کے اندر کی عورت کو کبھی کبھی ان کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی تھی' رنگ و بو' حسن و جمال اور جگمگاہٹوں کی اسیر دنیا۔ جو اس نے اپنے اردگرد پھیلا رکھی تھی' بنا رکھی تھی لیکن اس میں وہ اکیلی نہیں تھی' اس کا شوہر سجاد بھی برابر کا حصہ دار تھا۔ دونوں کے معمولات یکساں تھے۔ گھر سے راستے اکٹھے ہی باہر جاتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ باہر نکل کر راستے مختلف سمتوں میں بٹ جاتے اور رما یا سجاد کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ جس سمت چاہیں قدم اٹھالیں' کوئی روک ٹوک' کوئی پابندی نہیں تھی۔

سجاد کہتا تھا۔ ''راستے کیسے بھی ہوں' قدم مضبوطی سے پڑنے چاہئیں کوئی ہرج نہیں۔''

وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ جب راستے پھسلنے ہوں تو قدم مضبوطی سے جمتے ہی نہیں' پھسل جاتے ہیں' بہک جاتے ہیں۔ ادھر ادھر پڑنے لگتے ہیں۔ گرنے کا امکان ہوتا ہے اور سنبھلنے کے لیے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔

راہوں کی پھسلن کا احساس سجاد کو کچھ عرصہ بعد ہی ہو گیا تھا۔ رما کے قدم مضبوطی سے نہیں پڑ رہے تھے۔ اور وہ پھسلنی راہوں پر تیزی سے ڈھلان کی طرف پھسلتی جا رہی تھی۔

سجاد اسے روکنا چاہتا تھا۔ تھام لینے کے لیے لپکنا چاہتا تھا' بات بات پر ٹوک جھونک ہونے لگی تھی۔ اپنے شوہرانہ حقوق کا استعمال کرنے کی سوچی تھی' محافظ ہونے کے ناتے ڈرایا دھمکایا بھی تھا۔

لیکن رما جس روش پر چل دی تھی' قدم جس سمت اٹھ رہے تھے' مزاج جس فضا کا عادی ہو گیا تھا' اسے پلٹا کر لانا آسان کام نہیں تھا۔ وہ اپنی ناکامی کی صورت میں جز بز ہوتا رہتا تھا۔ ذہن منصوبے بناتا رہتا۔ احتجاج کے طور پر اس نے اس نمائشی زندگی سے کسی حد تک کنارہ کشی بھی کر لی تھی' وہ یہی توقع رما سے بھی کیے ہوئے تھا۔

لیکن رما تو ایسے ڈھلانی راستے پر تھی جہاں سے پھسلنا آسان ہوتا ہے لیکن واپس نیکی کی عمودی چٹان پر چڑھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے۔

سجاد کئی دنوں سے کلب گیا تھا نہ ہوٹل' بچے کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ اس لیے وہ اپنی شامیں اداس کر کے بچے کی طرف توجہ دے رہا تھا' اس کے ملنے والے اور ملنے والیوں کے فون پر فون آتے تھے۔

''بچہ بیمار ہے' میں نہیں آ سکتا۔'' سب کو وہ ایک ہی جواب دے رہا تھا لیکن رما اسی باقاعدگی سے شامیں باہر گزار رہی تھی۔ بلکہ اب تو اس نے راتوں کے کئی پہر بھی دوستوں کی نذر کرنا شروع کر دیئے تھے۔ سجاد کے شام کو گھر رہنے سے وہ مطمئن تھی۔ بچوں کو کمپنی دینے اور ان کی اداسیاں دور کرنے کے لیے ماں یا باپ دونوں میں سے کسی ایک کو گھر پر رہنا ہی چاہیے تھا۔

سجاد دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا' رما کبھی ہنس کر اور کبھی شعلہ رو ہو کر کہتی۔ ''صرف ماں ہی نہیں' باپ کا بھی فرض ہے' نبھاؤ اسے۔''

آج بھی جب وہ فرنچ شیفون کی خوبصورت ساڑھی میں ملبوس' جذبات انگیز سا میک اپ کئے' پرفیوم میں نہائی بیگ جھلاتی خواب گاہ سے تیار ہو کر نکلی تو سجاد بچوں کے ساتھ کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔

''رما۔۔۔۔۔۔۔!'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''ہوں'' ابرو چڑھا کر وہ اس کے لہجے کی کوفت پر بیزاری ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

''تابی کا بخار نہیں اترا۔''

''اتر جائے گا' میں نے ڈاکٹر ثانی کو فون کیا تھا' گلے کی وجہ سے بخار ہے' تشویش والی کوئی بات نہیں۔''

''وہ تمہیں مس کرتا ہے۔''

''میں نے دوپہر اس کے ساتھ گزاری تھی۔ تھوڑی دیر پہلے بھی اسے دیکھ کر گئی ہوں۔''

''وہ اب بھی تمہارے پاس رہنا چاہتا ہے۔''

اس نے تیز جلا دینے والی نگاہ سجاد پر ڈالی' پھر غصے سے بھڑک کر بولی۔ ''تم کیا چاہتے ہو سجاد؟''

سجاد نے لمحہ ضائع کئے بغیر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ایک ماں اور بیوی بن کر رہو۔''

رما نے سجاد کی طرف دیکھا۔ ایک قہقہہ لگایا۔

اور پھر قہقہے پر قہقہہ لگائے گئی۔ چھ سالہ بچی' بھائی کے پلنگ پر اس کے ساتھ لیٹی تھی' اٹھ کر بھاگی آئی' باپ کے ساتھ لگ کر اس نے ماں پر نگاہ ڈالی۔

لیکن رما کچھ کہے سنے بغیر ایک کھولتی نگاہ سجاد پر ڈال کر باہر نکل گئی۔ جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ جاتے جاتے کہا۔ ''آج مسٹر آفندی سے ملنا ہے اور تم جانتے ہو' کیوں ملنا ہے۔''

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو بچی نے مایوسی سے باپ کی طرف دیکھا۔ باپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ثنا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پیار کو ترسی بچی کے لیے یہ ہاتھ بھی غنیمت تھا جو شاید بھولے سے چند دنوں سے اس کے سر پر آن ٹکا تھا۔

ثنا کو لیے وہ پھر کمرے کے اندر آ گیا۔ تابی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا' آنکھیں بند تھیں اور ناک کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''تابی بیٹے!'' سجاد نے اس کی پیشانی کو ہونٹوں سے چھوا۔

''ماما!'' تابی غنودگی میں بڑبڑایا۔

''میں ہوں بچے! تمہارا بابا۔۔۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو بیٹے'' سجاد نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماما!'' وہ پھر بڑبڑایا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ یوں جیسے ماما کا چہرہ پکڑنا چاہتا ہو۔

سجاد نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ باری باری چوما بچے کے ہاتھ آگ کی طرح جل رہے تھے۔

آیا بچے کے لیے دودھ کا پیالہ لیے آ گئی۔

''بیگم صاحبہ چلی گئیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔۔۔'' سجاد زور سے چیخا۔ ثنا ڈر کر بستر میں دبک گئی۔ آیا کے ہاتھ میں دودھ کی پیالی لرز گئی اور بخار میں جلتے بجھتے بچے نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

سجاد پر آج مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ بخار کی اذیت میں مبتلا بچے کو جاتے ہوئے دیکھا تک نہیں تھا۔ شوہر کا غصہ تو الگ رہا اس نے ممتا کی کسک بھی محسوس نہ کی تھی۔ بچہ بخار کی حالت میں بھی ماما' ماما ہی پکار رہا تھا۔

بچے کی پکار سے سجاد کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔ آج وہ کچھ کر گزرنے کے مرحلے پر آ گیا تھا۔

وقت لمحہ لمحہ بن کر سرک رہا تھا۔ آیا نے بچے کو دوا دی اور ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں۔ بخار کچھ کم ہوا تو اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔

کرسی پر بیٹھا سجاد لپک کر قریب آیا۔

''تابی' میرے بچے!''

''ماما! ماما!'' بچے کی رندھی ہوئی آواز نے سجاد کا دل مسل دیا۔

سہمی سہمی ثنا نے باپ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''بابا! آپ ماما کو لے آئیں۔''

''کہاں سے لے آؤں؟'' سجاد بڑبڑایا۔

سجاد سارا وقت خود کلامی ہی کرتا رہا۔ بچے سو گئے۔ کبھی کبھی تابی کی آنکھ کھلتی۔ سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتا۔ بخار سے جلتی آنکھیں میچتا اور ''ماما' ماما'' کہہ کر پھر سو جاتا۔

یوں ہی رات لمحہ لمحہ بن کر ٹوٹتی رہی۔

ایک بج گیا۔

پھر دو بج گئے۔

چند منٹ اور گزرے تھے کہ پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ رما آ گئی تھی' اس نے لاک میں چابی گھمائی' دروازہ کھولا اور کاریڈور میں آ گئی۔ کمرے میں بے تابی سے ٹہلتے سجاد نے اس کی نوک دار ہیل کی ٹک ٹک سنی۔

وہ بیگ جھلاتی لہراتی بل کھاتی چلی آ رہی تھی۔

سجاد بچوں کے کمرے سے نکل کر عین اس وقت جب وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہو رہی تھی' سامنے آ گیا۔

''ہائے۔۔۔۔۔۔۔'' رما نے بڑی مسرت سے بہکتے ہوئے اسے دیکھا۔

''آ گئی ہو۔۔۔۔۔۔۔؟'' سجاد اس کے سامنے آ کر غرایا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔'' وہ بڑی موج میں تھی۔

''تمہیں پتہ تھا تابی بخار میں جل رہا ہے۔'' وہ پھر غرایا۔

''اوہ ہاں۔۔۔۔۔۔۔ کیسا ہے وہ؟'' رما جھوم رہی تھی' اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور سانسوں میں شیمپین کی بو تھی۔ پھر اس نے سجاد کا جواب سنے بغیر بیگ کھولا' اس میں سے تہہ شدہ کاغذ نکالے' ہاتھ اوپر اٹھایا۔ کاغذوں کو ہوائی بوسہ دیتے ہوئے سجاد سے بولی۔ ''لو ہو گیا کام ۔۔۔۔۔۔۔ آخری دستخط بھی ہو گئے ۔۔۔۔۔۔۔ خوش ۔۔۔۔۔۔۔ تین لاکھ کا پرافٹ ۔۔۔۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے کاغذ سجاد کی طرف اچھال دیئے۔ اور بہکے بہکے قدموں سے کمرے میں چلی گئی۔ کاغذ قالین پر سجاد کے قدموں میں گر

گئے۔

سجاد نے جھک کر وہ کاغذ اٹھائے۔

شعلہ بار نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر پرزے پرزے کر کے ہوا میں منتشر کر دیئے۔ کاغذ تلف کر کے بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔

وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے مٹھیاں کھولنے اور بند کرنے لگا۔

رما نے ان کاغذوں پر دستخط کروانے کے لیے اخلاق کی جو آخری حدیں پھلانگی ہوں گی وہ جانتا تھا۔ آج اچانک ہی اس کے اندر کا غیرت مند مرد جاگ اٹھا۔ اس نے اسے جھنجھوڑا' بھڑکایا اور وہ جو کچھ کر گزرنے کا منصوبہ سوچ کر حدوں تک ہی بنائے تھا' اس مرد نے اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے اکسایا۔ وہ شعلوں کی طرح بھڑکتا خواب گاہ میں داخل ہوا۔

رما کپڑے بدلے بغیر ہی بیڈ پر چت پڑی تھی۔ بے ترتیبی سے پڑی اس عورت کو شوٹ کر دینے کے لیے اس نے الماری سے پستول نکالا۔

لیکن وہ ہاتھ میں پستول پکڑے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ کوئی فیصلہ کن لمحہ چیخ اٹھا تھا اور وہ پستول ہاتھ میں پکڑے بیڈ پر پڑی رما کو تکنے لگا تھا۔ اور پھر تکتے ہی تکتے فیشن ایبل ماڈل اور پرکشش رما کے وجود سے ارم نکل آئی تھی۔

ارم جو معصوم اور پاکیزہ تھی۔ بھولی بھالی سیدھی سادی اپنے حسن تک سے بے خبر۔۔۔۔۔۔۔ ارم۔۔۔۔۔۔۔ جو بات کرتے وقت شرما جاتی تھی' جس کے کانوں کی لویں ذرا ذرا سی بات پر جل اٹھتی تھیں' جو حیا و فا مرقع تھی۔

آٹھ نو سال پہلے وہ اس سے ایک خاندانی تقریب میں ملا تھا' اس کی عمر اس وقت اٹھارہ انیس سال تھی۔ شادی کی تقریب میں شامل لڑکیوں میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ شرمیلی لڑکی تھی۔ سارا وقت سکڑی سمٹی ایک کونے میں اپنی ماں کے ساتھ لگی بیٹھی رہی تھی۔

وہ سجاد کی دور پار کی عزیزہ بھی تھی۔

سجاد پھول پر بھنورے کی طرح منڈلانے لگا۔ ارم اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے سرخ ہوتی رہی' کچھ خوفزدہ' کچھ ہراساں ہو کر ماں سے زیادہ ہی چپک گئی۔

سجاد اس معصوم سی حسین لڑکی پر مفتون ہو گیا۔ ان دنوں وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں پرچیز آفیسر تھا۔ معقول تنخواہ کے ساتھ ساتھ

بالائی آمدنی بھی تھی۔ ٹھاٹھ باٹھ بھی خوب تھے۔ ماں بہنیں اپنے برسرروزگار بیٹے کے لیے دلہن کی تلاش میں بھی تھیں۔

سجاد نے ارم کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے ماں سے کہا۔ ''شادی ہوگی تو اس لڑکی سے ورنہ کہیں نہیں کروں گا شادی۔''

ارم کے والدین عام سے متوسط گھرانے کے لوگ تھے۔ بہت بڑے جہیز کی خواہشمند ماں وہاں رشتہ کرنے پر رضامند کیسے ہوتی۔ لیکن سجاد تو اس پر فریفتہ ہو چکا تھا' اپنی ضد پر اڑ گیا۔ ماں کو بات ماننا ہی پڑی۔

ارم حسن جہاں سوز کی بیش بہا دولت اور معمولی جہیز کے ساتھ دل کی رانی بن کر سسرال میں آ گئی۔

سجاد خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ تقدیر نے اتنا حسین ساتھی اسے بخش دیا تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر اس کے سنگ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے وہ مسرت و تفاخر سے لبالب پیمانے کی طرح چھلک چھلک جاتا تھا۔

سجاد ان دنوں کرائے کے ایک پختہ مکان میں رہتا تھا۔ ارم کو وہ اس گھر میں لے آیا۔ یہ گھر ان کی چھوٹی سی جنت بن گیا۔ اس جنت کی رعنائیوں' دلفریبیوں اور خوبصورتیوں میں اضافے کے لیے ارم اور سجاد کوشاں تھے۔ ارم سجاد کی طرح بے باکی سے اپنے پیار کا اظہار تو نہ کر پاتی' لیکن اس کی ایک ایک ادا' ایک ایک حرکت' ایک ایک غمزہ اس کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔

ازدواجی زندگی کا آغاز انہوں نے پیار و محبت کی نرم گرم پھوار تلے کیا۔ سرشاری کی کیفیت دونوں ہی پر طاری رہتی۔ سجاد تو صرف اور صرف ارم ہی کا ہو کر رہ گیا۔ ارم کو وہ محبت سے رما کہنے لگا۔

سجاد اپنے دوست' احباب میں بڑا مقبول تھا۔ دوستوں نے اس کی یہ کنارہ کشی دیکھی تو سر ہو گئے۔

''حد ہو گئی یار۔۔۔۔۔۔۔''

''تمہاری انوکھی شادی ہوئی ہے۔''

''سب کو بھلا دیا۔۔۔۔۔۔۔''

''ہمیں بھی تو متعارف کراؤ اس ہستی سے جس نے تمہیں اپنا گرویدہ بنا کر سب سے بیگانہ بنا دیا ہے۔''

''تم بڑے نمک حرام نکلے۔''

''دوستوں سے دوستی نباہنے کے وعدے کیا ہوئے؟''

''ایک بار بھی نہیں بلایا' بھابی ہی سے متعارف کروا دیتے۔''

دفتر کے اوقات میں دوستوں کی باتیں سن کر وہ مسکراتا رہتا۔ وہ تو وقت دھکیل رہا ہوتا۔ چھٹی ہوتے ہی گھر بھاگتا۔ پھر اسے

دوست یاد رہتے نہ ان کی باتیں۔ وہ ہوتا اور اس کی رما۔۔۔۔۔۔۔ پیار کی دلفریبیاں' محبت کی جنون خیزیاں اور عشق کی سرگردانیاں ۔۔۔۔۔۔۔ زندگی کتنی بھرپور تھی ان دنوں۔

دوست لگاتار فہمائش کرتے تھے۔ ایک دن اس نے اپنے چھ سات انتہائی قریبی اور بے تکلف دوستوں کو دعوت دے ہی ڈالی۔

''رما!'' اس نے دعوت کے متعلق بتایا۔ ''پکالوگی اتنے آدمیوں کا کھانا؟''

''کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں۔''

''خوب شاندار سی دعوت ہو۔''

''آپ فکر نہ کریں' آپ کے دوست کھانا کھا کر یاد کریں گے۔''

رما نے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ اس کے پاس خانساماں تھا نہ کچن کا کام کرنے والی نوکرانی۔ بس ایک ملازمہ تھی جو ادھر ادھر کا کام کرتی تھی۔ رما کو صبح سے کام میں جٹے دیکھ کر سجاد کا دل مسلا جا رہا تھا۔

''رما! تھک تو نہیں گئیں؟''

وہ پھول کی طرح کھلی جا رہی تھی' مسکرا کر سجاد کو دیکھا اور بولی۔ ''کام ہی کیا کیا ہے' تھک کس بات سے جاؤں گی۔''

''تمہارے یہ نازک نازک ہاتھ کام کے لیے نہیں بنائے گئے۔'' وہ رومانٹک ہو گیا۔

''تو کس لیے بنائے گئے ہیں؟'' وہ بھی ادائے ناز سے مسکرائی۔

سجاد نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا ساز دل چھیڑنے کے لیے بنائے گئے ہیں رما جی! میرا جی چاہتا ہے' تمہارے لیے درجنوں نوکر رکھوں' بیرا' خانساماں' مالی' چوکیدار' آیا۔۔۔۔۔۔۔''

''بس' بس۔۔۔۔۔۔۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''اتنا نہ اڑیے جناب!''

''اڑان تو اپنی اتنی اونچی ہے کہ سنو تو ششدر رہ جاؤ۔''

''یعنی؟''

''خوبصورت بیوی' محل نما کوٹھی' نئے ماڈل کی گاڑیاں' نوکر چاکر اور اتنا روپیہ' اتنا روپیہ۔۔۔۔۔۔۔''

''جو گنا نہ جا سکے۔'' رما ہنس کر بولی۔

''ہاں رما' واقعی اتنا روپیہ۔۔۔۔۔۔۔ جو گنا نہ جا سکے' بے حد و حساب'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ میری دلی خواہش ہے' آرزو ہے

اور دیکھ لینا ایک نہ ایک دن میری یہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔ مجھے یہ سب کچھ حاصل کرنا ہے اور ضرور کرنا ہے۔"

وہ ہنسی پھر اترا کر اسی کے لہجے میں بولی۔ "اس کے لیے چاہے چوری کرنا پڑے؟"

"یہی سہی۔"

"ہٹیں جی۔۔۔۔۔۔۔ ایسی باتیں مت سوچا کریں۔"

"سوچوں گا نہیں' تو پاؤں گا کیسے۔۔۔۔۔۔۔ تم کیا جانو' میرے ذہن میں کتنے منصوبے پل رہے ہیں۔ ایک نہ ایک تو قابل عمل ہوگا ہی۔"

رما اس کی آنکھوں میں ان گنت خوابوں کے سائے لہراتے دیکھ کر ہنس پڑی۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو' یہ بتاؤ رات کپڑے کون سی پہنو گی؟"

"رات؟"

ہاں بھئی دعوت میں۔"

"دعوت میں!" وہ حیرانگی سے آنکھیں پھیلا کر بولی۔ "مردوں کی دعوت میں میرا کیا کام؟"

"پاگل۔۔۔۔۔۔۔" وہ ایک دم بولا۔ "دعوت پر بلایا ہے لوگوں کو تو خود شریک نہیں ہوگی؟"

"لیکن وہ سب تو آپ کے دوست ہیں' صرف مرد آ رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟"

"میں ان کے سامنے جاؤں گی؟"

"حد ہوگئی تمہاری بیوقوفی کی رما"

"نہیں جی' میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ میں آج تک کسی غیر مرد کے سامنے نہیں گئی' کسی سے نہیں ملی۔۔۔۔۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی سب کے سامنے۔"

سجاد ہنس پڑا۔ پھر بولا۔ "جاہلوں والی باتیں مت کرو۔"

"آپ جانتے ہیں' میں نے کس ماحول میں پرورش پائی۔ ہمارے ہاں غیر عورتوں' مردوں کا ملنا جلنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

"رما!" وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ "ایسی جاہلانہ باتیں مت سوچو۔۔۔۔۔۔۔ اب تم میری بیوی ہو اور میں اپنے گھر کا جو ماحول

بناؤں گا' تمہیں اسی میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنا ہوگا۔ مجھے یہ دقیانوسی باتیں بالکل پسند نہیں۔۔۔۔۔۔۔ سمجھیں!''

''اللہ'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''آپ سمجھتے کیوں نہیں' میں مردوں میں اکیلی کیا کروں گی۔۔۔۔۔۔۔ سب مرد ہی آرہے ہیں نا؟''

''تم میزبان ہو اور خوش اخلاقی سے یہ فرض ادا کرو گی۔۔۔۔۔۔۔ اتنی خوش اخلاقی سے کہ جہاں وہ تمہاری شکل وصورت کے مداح ہوں گے' وہاں تمہارے اخلاق کے بھی گرویدہ ہو جائیں گے۔''

سیدھی سادی مشرقی لڑکی' جس نے باپ کی دہلیز پھلانگی تو شوہر کی دہلیز پر قدم رکھ دیئے تھے' سجاد کی باتیں سن کر سکتے میں آ گئی۔

سجاد نے اسے ماڈرن بننے کے لیے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ رما حیرت زدہ سی سنے گئی' پھر بھی ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''سجاد! خدا کے لیے' مجھے مجبور نہ کریں' مجھے ڈر لگتا ہے' شرم آتی ہے۔''

''جاہلانہ باتیں یہاں نہیں چلیں گی رما! یہ بات اچھی طرح سوچ لو۔''

رما نے پھر بھی منتیں کیں لیکن سجاد اسے اپنی بے عزتی کے مترادف سمجھنے لگا۔

رات' رما کو اس کی مرضی کے مطابق تیار ہونا پڑا۔ شیفون کی مہین چمکیلے باڈر والی ساڑھی' اس کے ساتھ بغیر آستین کا بلاؤز' جس کا گریبان آگے پیچھے سے خوب گہرا تھا اور جس کی چولی کمر کی عریانی کو اجاگر کرتی تھی' مجبور کر کے سجاد نے رما کو پہنائی۔ بال بنوائے' میک اپ کروایا اور یوں رما کو اپنے دوستوں سے متعارف کرایا۔

رما' جس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا' جس کی نگاہیں جھکی جا رہی تھیں اور جو دوستوں کی بے تکلف باتوں کا سر کے مثبت اور منفی اشارے ہی سے مشکل سے جواب دے پا رہی تھی' سجاد کے لیے فخر وانبساط کا مرقع بنی ہوئی تھی۔

''شاباش۔۔۔۔۔۔۔'' دوستوں کے جانے کے بعد اس نے رما سے کہا۔ ''گنگ ہو گئے سب تمہیں دیکھ کر۔ آئندہ ان سب پر باتوں کا جادو بھی کرنا ہے۔۔۔۔۔۔۔ سمجھیں!۔۔۔۔۔۔۔ آج معاف کیا' گونگی بنی بیٹھی رہیں تم۔''

رما کچھ نہیں بولی۔ سجاد کی خوشی پر اس نے اپنی شرم وجھجک نچھاور کر دی تھی۔

غیر مردوں کی تعریفی نظریں اسے اپنے بدن میں سوئیوں کی طرح چبھتی محسوس ہوئی تھیں پھر بھی سجاد کی خاطر اس نے برداشت کیا تھا۔ کئی دن وہ اپنی نظروں میں سبک رہی۔

یہ ایک دفعہ کی بات نہیں تھی' سجاد ماڈرن بننا چاہتا تھا' حسین وجمیل بیوی گھر میں بند رکھنے کے لیے تو نہیں تھی۔ رما کو سجاد کے ساتھ ہوٹل' کلب' بازار یا کسی بیوی بچوں والے دوست کے ہاں جانا برا نہیں لگتا تھا۔ وہ کتراتی تھی تو مردوں کی محفل سے لیکن جب ایسی

محفلوں میں ایک آدھ دوسرے دوستوں سے بات چیت کرتے ہوئے پہلے کی طرح پسینہ پسینہ نہیں ہوتی تھی۔ ویسے بھی تعریف' عورت کی کمزوری ہوتی ہے۔ رما پر تو تعریفوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسے یہ اچھا لگنے لگا تھا پھر سجاد کی خوشی بھی تو مقصود ہوتی تھی۔ کتنا اتراتا تھا وہ۔۔۔۔۔۔۔ کیسے فخر سے تعارف کرواتا تھا اس کا نئے نئے لوگوں سے۔

سال ڈیڑھ سال میں وہ خاصی سوشل ہو چکی تھی۔ ثناء پیدا ہوئی تو ماں بن کر اس میں خاصا اعتماد آ گیا تھا۔

بچے کی پیدائش کے بعد سجاد نے اسے متنبہ کر دیا تھا۔

''رما! مجھے بھدی عورتیں بالکل پسند نہیں۔ تم جیسی پہلی تھیں' بچے کی پیدائش کے بعد بھی ویسا ہی رہنا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔ سمجھیں!''

رما کو سجاد کی یہ بات بری لگی' لیکن اس نے اس کے بعد اپنا خاص خیال رکھا' خوراک اور ورزش دونوں ہی کی طرف خاص دھیان دیا۔ اس طرح وہ نہ صرف اپنی خوبصورتی کو برقرار رکھ پائی بلکہ کچھ زیادہ پرکشش اور جاذب نظر ہو گئی۔

اس رات ایک مقامی ہوٹل میں ڈنر تھا۔ کنسٹرکشن کمپنی کا کراچی والا ڈائریکٹر آیا ہوا تھا' اسی کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام تھا۔

سجاد' رما کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ رما نے آج بڑا جاذب نظر لباس پہنا ہوا تھا جو اس کے قیامت خیز حسن پر بے طرح کھل رہا تھا۔ وہ اتنی پرکشش لگ رہی تھی کہ جو نظر اس کی جانب اٹھتی' چند لمحوں کو ساکت سی ہو جاتی۔ کچھ اور عورتیں بھی مدعو تھیں' رما انہی کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے پلیٹ ہاتھ میں لیے کھانا کھا رہی تھی کہ دو نظریں اس کا مستقل تعاقب کرتے ہوئے پکڑی گئیں۔

رما نے ان نظروں کا تعاقب محسوس کیا۔ ڈری تو نہیں' ہاں اسے اس طرح محفل میں گھورے جانا پسند نہ آیا تھا۔ اسی لیے وہ عورتوں کے حلقے میں کھڑی تھی۔ نظریں مسلسل اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ پھر جب وہ کھانا لینے کے لیے قدم اٹھانے کو ہی تھی کہ چالیس پینتالیس سالہ اونچے لمبے قد اور بھاری بھرکم جسم والا ڈائریکٹر اس کے قریب آ گیا' اس کی نظریں اب بھی رما پر جمی تھیں۔

''آپ کی تعریف؟'' اس نے کہا۔

''میں ایسی اہم شخصیت نہیں ہوں کہ تعارف ضروری ہو۔'' رما کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

اسے اس آدمی سے بات کرنا اچھا نہیں لگا۔ ہال میں بہت سے لوگ تھے' کھانا کھا رہے تھے' ٹولیوں کی صورت میں بھی اور دو دو ایک ایک بھی۔ رما اس آدمی سے پیچھا چھڑانے کو میز کی دوسری طرف چلی گئی۔ وہ اس کے پیچھے آ گیا۔

''آپ کون ہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''میں مسز سجاد ہوں۔'' وہ قدرے برہمی سے پیچھا چھڑانے کو بولی۔

''وہ سجاد جو ہماری کمپنی میں۔۔۔۔۔۔۔''

''جی ہاں' وہی۔۔۔۔۔۔۔''

''گڈ''

وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پلیٹ میں کھانا ڈالنے لگی۔

''میں عشرت ہوں۔'' وہ خود ہی قریب آ کر بولا۔''اس کمپنی کا ڈائریکٹر۔۔۔۔۔۔۔''

رما نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے بنا اپنے گروپ کی طرف جانے لگی۔

''میں سجاد کا باس ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''میرے تو نہیں۔'' جھلا کر رما نے جواب دیا۔

وہ اس جواب پر ہنس پڑا۔ پلیٹ میں مرغ کا ایک پیس رکھتے ہوئے بولا۔''بہت دلچسپ ہیں آپ' جتنی حسین ہیں اتنی ہی ذہین بھی لگتی ہیں۔''

''شکریہ'' ناگواری سے رما نے کہا اور اپنے گروپ کی طرف ہو گئی۔

وہ ہنس پڑا۔ شاید کچھ کہتا بھی کہ چند لوگ اس کی طرف آ گئے اور وہ ان سے باتیں کرنے میں لگ گیا۔

جتنی دیر رما ہال میں رہی عشرت کی مسکراتی' شوخ اور بے باک نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

گھر آتے ہی اس نے سجاد سے اس شخص کی بدتمیزی کی شکایت کی تو وہ ہنس کر بولا۔''ظالم! تم چیز ہی ایسی ہو۔''

وہ غصے سے بولی۔''مجھے اس کی قسم کی باتیں بالکل پسند نہیں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔''بڑی ناشکری ہو تم' اس اعزاز پر تو تمہیں فخر کرنا چاہیے۔ جانتی ہو وہ کون تھا؟''

''تو آپ کو پتہ تھا وہ میرے پیچھے لگا ہوا ہے؟'' رما نے آنکھیں پھیلا کر سجاد کو دیکھا۔

وہ ہنس پڑا۔

رما جز بز ہوتی رہی۔

تیسرے ہی دن سجاد دفتر سے آیا تو خوشی سے اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ آتے ہی رما کو دو تین چکر دے ڈالے۔

''اللہ۔۔۔۔۔۔۔ کیا ہوا ہے' بڑے خوش نظر آ رہے ہیں۔''

''رما! جان لو کہ ہمارے دن پھر گئے۔ ہمارے خواب پورے ہونے کی آس لگ گئی۔'' وہ بے خود سا ہو گیا۔

رما اس کی بے خودی پر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کچھ پتہ بھی تو چلے۔''

''عشرت صاحب نے مجھے کراچی آفس میں جگہ دے دی۔''

''کیوں؟''

''کیوں کا کیا جواز۔۔۔۔۔۔۔ یہ پوچھو کہ وہاں جانے سے کیا فائدہ ہوگا۔''

''ہوں''

''تنخواہ اس سے تین گنا زیادہ' گاڑی ملے گی' گھر کمپنی لے کر دے گی۔''

رما اتنی بڑی خوشخبری پر کچھ زیادہ خوش نہ ہو سکی۔ خطرے کے حساس الارم خبردار کرنے کو ایکا ایکی بج اٹھے۔ عشرت نے یہ مراعات کیوں دی تھیں؟ اتنا مہربان کیوں ہو گیا تھا؟ وہ سوچنے لگی۔

''بس سمجھو کہ دن پھر گئے ہمارے' ترقی کے زینے پر یہ پہلا قدم ہے میری جان! آگے آگے دیکھتی جانا' ایک دن مابدولت بھی اس کمپنی کے ڈائریکٹر بن جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔ سمجھیں!''

وہ تو بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ خوش ہونے کی بجائے جھلا کر بولی۔ ''یہ آدمی مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

سجاد غصے سے بولا۔ ''تم جو جی میں آئے سمجھو' لیکن میں یہ پیشکش ٹھکرانے کا نہیں۔''

رما چپ ہو گئی۔

سجاد واقعی یہ پیش کش نہیں ٹھکرا سکتا تھا۔ یہ راستہ تو اس کے خوابوں کے جھروکے کو جاتا تھا' وہ اس پر گامزن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اونچی اڑانیں کسی ایسے ہی موقعے کی منتظر تھیں۔ اس کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھا۔

کراچی واپسی سے پہلے عشرت نے سجاد اور رما کو بطور خاص ڈنر کی دعوت دی۔

رما نے دعوت پر جانے سے انکار کر دیا۔

''سجاد! یہ آدمی مجھے اچھا نہیں لگتا' اس کی نظروں میں بڑی عریانی ہے' میں۔۔۔۔۔۔۔''

''زیادہ بک بک نہ کرو۔۔۔۔۔۔۔'' سجاد جھلا کر بولا۔ ''وہ میرا باس ہے' میرے سنہرے مستقبل کے لیے تگ و دو کر رہا ہے اور تم چاہتی ہو تمہاری حماقتوں پر میں سب کچھ قربان کر دوں۔''

رما آنکھیں پھیلائے اسے تکنے لگی۔

پھر وہ قدرے نرمی سے بولا۔ ''بڑے لوگوں کے طور طریق اپناؤ جانم! ان لوگوں کا آپس میں ملنا جلنا ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے جا شرم اور جھجک کی اس طبقے میں گنجائش نہیں ہوتی۔''

''سجاد۔۔۔۔۔۔۔!'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''اتنے ماڈرن نہ بنو ہم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس میں یہ سب باتیں۔۔۔۔۔۔''

''اوہ۔۔۔۔۔۔۔بس بھی کرو۔ تمہارے خیالات انتہائی احمقانہ اور فرسودہ ہیں۔ میں تمہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں کہ ترقی کرنے کے لیے ان بیہودہ روایات کا سہارا لینے کی بجائے انہیں توڑ دو ٹھکرا دو۔۔۔۔۔۔۔ یہ ترقی کی راہ میں آڑے آتی ہیں۔''

سجاد کے سر پر اونچا اڑنے' بڑا آدمی بننے اور دولت حاصل کرنے کا بھوت سوار تھا۔ رما اگر ان سب کے حصول کے لیے درمیانی رابطہ تھا' تو کیا ہوا۔

وہ سب کچھ جانتا تھا۔

سب کچھ

پھر بھی رما کو مجبور کر رہا تھا۔ رما نے لڑائی کی' سمجھایا' اس شخص سے دور رہنے کو کہا لیکن وہ تو غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اسے دھمکی دے ڈالی۔ ''جو میں کہوں گا' تمہیں کرنا ہو گا۔۔۔۔۔۔۔نہیں تو میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں رہے گا' یہ ذہن نشین کر لو۔''

اس دن رما بہت روئی' لیکن سجاد کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

سجاد کی پسند کی ساڑھی پہنی' میک اپ کیا اور ڈنر میں شرکت کے لیے ہوٹل سے آنے والی گاڑی میں بیٹھ کر عشرت کے پاس گئی۔ سجاد بھی ساتھ تھا۔ رما پھر بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہی تھی۔ وہ اکھڑی اکھڑی بیٹھی رہی۔ عشرت کی نگاہوں کی چبھن وہ اپنے چہرے اور جسم پر برابر محسوس کر رہی تھی۔

عشرت بظاہر سجاد کی طرف متوجہ تھا' اسے سبز باغ دکھا رہا تھا' اس کی تعریفیں کر رہا تھا' اس کی محنت اور کام کی لگن کی سراہا جا رہا تھا لیکن رما جانتی تھی کہ وہ اتنا حسین جال کیوں پھیلا رہا ہے۔

کھانے کے بعد عشرت دونوں کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہیں اس نے بدتمیزی کی۔ رما کی ساڑھی کا آنچل ڈھلک کر بازو سے نیچے آ گیا تھا۔ وہ اسے درست کرنا ہی چاہتی تھی کہ عشرت نے ہاتھ بڑھا کر آنچل پکڑا اور اس کے کندھے پر ڈال دیا۔

رما بھڑک اٹھی۔ جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے ہٹاتے ہوئے غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''عشرت صاحب! میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں کہ۔۔۔۔۔۔۔''

اس کی آواز گھٹ گئی۔ سجاد نے گھور کر اسے دیکھا لیکن وہ غصے سے پاؤں پٹختی کمرے سے نکل گئی۔

یہ عشرت کی بے عزتی تھی۔

سجاد شرمندہ ہو کر بولا۔ ''سر! میں رما کی طرف سے معافی۔۔۔۔۔۔''

عشرت گھاگ اور کائیاں آدمی تھا' ہنس کر بولا۔ ''معافی تو رما کو مانگنا پڑے گی۔ وہ شاید جانتی نہیں میں کون ہوں۔ میاں! پہلے بیوی کو سوسائٹی کے ایٹی کیٹس سکھاؤ' ہونہہ۔۔۔۔۔۔'' پھر عشرت نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی جا سکتے ہو۔''

''سر۔۔۔۔۔۔!'' سجاد ہکلا گیا۔ قریب آئی کامیابی اسے لگا دور بہت دور چلی گئی ہے۔

عشرت نے اسے ہاتھ سے باہر جانے کا راستہ بتا دیا۔

وہ سر جھکائے کمرے سے نکل آیا۔

اس رات رما اور سجاد میں خوب لڑائی ہوئی۔ رما نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا۔ ''آئندہ میں کسی پارٹی میں نہیں جاؤں گی۔ تمہارے کسی دوست سے نہیں ملوں گی۔ تمہارے اس کمینے باس کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔''

سجاد اس دھمکی پر بپھر گیا۔ عشرت اس کا ان داتا تھا' اس کے خوابوں کی تعبیر اس کے توسط کے ملنے والی تھی۔ وہ اسے ناراض کیسے کر سکتا تھا۔ سجاد کی یہی کمزوری تو عشرت نے بھانپ لی تھی۔ سجاد مصر تھا کہ رما عشرت سے مل کر اپنے رویے کی معذرت کرے۔

وہ بپھری ہوئی تھی۔ وہ اس کمینے کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' جو جی چاہے کر لو' میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔''

تو تکار بڑھی' سجاد نے رما کو مارا پیٹا' بچی چھین کر گھر سے نکال دینے پر اتر آیا۔ دو تین دن تک یہی کچھ ہوتا رہا۔ اور اس دن سجاد نے واقعی بچی چھین کر اسے گھر سے نکال باہر کیا تو رما کی ممتا بلبلا اٹھی' اندر ہی اندر کھولتی رہی لیکن بچی کی خاطر سجاد کے آگے جھک گئی۔

پھر وہ عشرت سے معذرت کرنے ہوٹل گئی۔ سجاد اسے چھوڑ کر خود نیچے لاؤنج میں آ گیا۔

عشرت اپنی فتح کے نشے میں چور تھا لیکن دانستہ رما کو کچھ نہیں کہا۔ شرافت کا لبادہ اوڑھ کر اپنی گھناؤنی صورت چھپا لی۔

رما بھی قدرے پسیجی' اپنے رویے پر نادم ہوئی۔ بڑے آدمیوں کے اخلاقی دائرے میں یہ بات انتہائی معمولی تھی جسے اس نے انا

کا مسئلہ بنالیا تھا۔

وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ سجاد کی تعریف کی۔ اس کی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لیے وہ اسے کراچی لے جا رہا تھا۔

''مسز سجاد! میں نے آپ کے شوہر میں جو صلاحیتیں دیکھی ہیں' وہ اگر یہاں کام کرتا رہا تو زنگ آلود ہو جائیں گی۔ اسے وسیع میدان کی ضرورت ہے۔ وہ بہت کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چند سالوں میں آپ دیکھیں گی کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ پرخلوص اور دوستانہ مشورہ ہے میرا کراچی جانے کا۔۔۔۔۔۔۔ آپ معترض تو نہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

چند منٹ دونوں باتیں کرتے رہے' بالکل عام سی باتیں' دوستوں کی سی باتیں۔۔۔۔۔۔۔ رما نے جانے کی اجازت چاہی تو عشرت بھی اٹھا۔ ''ذرا ٹھہریئے۔''

''کیوں؟''

''دیکھئے ہر بات کو بدگمانی کی نظر سے مت دیکھئے۔''

رما نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ الماری کی طرف بڑھا اور مخملی ڈبیہ میں پڑے دو خوبصورت کنگن نکالے۔ کنگن اپنی آب و تاب سے ہی قیمت بتا رہے تھے۔

رما سہم گئی۔

وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔ ''آپ نے یہاں آ کر اپنے روپے کی تلافی کی ہے۔''

''وہ۔۔۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔۔۔'' رما ہچکچائی۔

''میں بھی اپنے روپے کی تلافی کر رہا ہوں۔''

اس نے بلا جھجک رما کے ہاتھ پکڑے' رما کے اندر عنصلی طوفانی لہریں اٹھیں' چہرہ سرخ ہو گیا۔ عشرت نے کنگن اس کے ہاتھوں میں پہناتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ جا سکتی ہیں۔''

''یہ۔۔۔۔۔۔۔ یہ کنگن۔۔۔۔۔۔۔؟''

''آپ کے لیے۔''

''کیوں؟''

''روپے کی تلافی کے طور پر۔''

تلافی یا قیمت کے طور پر۔۔۔۔۔۔۔اس نے سوچا' مگر کہہ نہ سکی۔

عشرت نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول کر جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ رما کی بری حالت تھی۔ کنگن اس کی سڈول کلائیوں کے گھماؤں پر سنپولوں کی طرح لپٹے تھے۔ لفٹ سے نیچے آنے تک اس کی ذہنی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ غصے' ندامت اور گھبراہٹ سے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔ سجاد نے محسوس کیا' اسی لیے چپ رہا۔ گھر آنے تک اس نے کوئی بات نہ کی۔

گھر آتے ہی سجاد نے رما کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ ''خوش ہو گئے عشرت صاحب؟''

''یہ دیکھو' خوشی کا اظہار۔۔۔۔۔۔۔'' رما نے اپنی دونوں کلائیاں اس کے سامنے کرتے ہوئے غصے سے بھڑک کر کہا۔

''یہ۔۔۔۔۔۔۔یہ کیا۔۔۔۔۔۔۔؟'' سجاد نے اس کی دونوں کلائیاں تھام کر حیرانگی اور مسرت سے کنگن دیکھے۔

''کنگن۔۔۔۔۔۔۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

''بہت خوبصورت ہیں' پہلی ملاقات پر تمہیں دے دیئے عشرت صاحب نے' بھئی بہت لکی ہو تم' عشرت صاحب تو کسی کو منہ ہی نہیں لگاتے۔ تم پر اتنے مہربان ہو گئے' بہت۔۔۔۔۔۔۔بہت لکی ہو تم۔''

''واقعی ۔۔۔۔۔۔۔ بہت لکی ہوں میں ۔۔۔۔۔۔۔ پہلی کمائی ۔۔۔۔۔۔۔ یہ پہلی کمائی ہے میری ۔۔۔۔۔۔۔ قیمتی کنگن۔۔۔۔۔۔۔'' وہ بے اختیارانہ ہنس پڑی' ایک پاگل ہنسی۔

''رما!'' سجاد نے اسے اس دیوانے پن پر جھنجھوڑا۔

''یہ میری پہلی کمائی ہے سجاد۔۔۔۔۔۔۔پہلی کمائی'' وہ کلائیاں بار بار سجاد کے سامنے کرتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں دہراتے گئی۔

''رما! کیا بک رہی ہو؟'' سجاد نے جھلا کر کہا۔

''غلط تو نہیں کہہ رہی۔'' وہ پھر ہنس پڑی۔ ''عشرت نے میرے کندھے پر آنچل ڈالتے ہوئے صرف ہاتھ کا دباؤ ہی تو ڈالا تھا۔ اس جذباتی دباؤ کی قیمت یہ کنگن ملے۔ کچھ زیادہ چھیڑ چھاڑ کرے گا تو اس سے بھی زیادہ ۔۔۔۔۔۔۔ اس سے بھی قیمتی۔۔۔۔۔۔۔''

''رما!'' سجاد نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ ''فضول باتیں مت کرو۔''

لیکن رما کی ذہنی حالت ٹھیک نہ ہوئی۔ اس نے اپنی معصوم سی بچی کو بھی کنگن دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اب تیری ماں بھی کمانے لگی ہے۔''

''ثنا۔۔۔۔۔۔۔ یہ کنگن پہلی کمائی کے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ بہت کچھ لائے گی ابھی' بہت کچھ۔۔۔۔۔۔۔''

معصوم بچی بھلا کیا سمجھتی۔۔۔۔۔۔۔ ہاں سجاد بپھر گیا۔

'' بکواس بند کرتی ہو یا نہیں؟''

رما نے غصے سے کنگن اتار کر سجاد کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ ''واپس کر آؤ انہیں' کس خوشی میں دیئے ہیں اس نے یہ کنگن ۔۔۔۔۔۔۔ یہ مجھے ڈس رہے ہیں' لے جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ واپس منہ پر مار کے آؤ اس کے۔۔۔۔۔۔۔ اپنی بیوی کی بے عزتی۔۔۔۔۔۔۔''

''خاموش ہو جاؤ رما۔۔۔۔۔۔۔'' سجاد نے غصے سے کہا۔

''پہلے کنگن واپس کر کے آؤ۔'' وہ بھی غصے سے بھڑک کر بولی۔

سجاد نے جھک کر کنگن اٹھائے۔

رما کے اندر سکون کی لہر اٹھی۔ سجاد کی غیرت جاگ ہی اٹھی تھی' اس نے یہ سمجھا۔

سجاد کنگن ہاتھ میں لیے چند لمحے کھڑا رہا۔

''لے جاؤ انہیں' منہ پر مارو اس ذلیل کے۔'' وہ چیخی۔

سجاد نے کنگن واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

رما اپنے بے غیرت شوہر کو آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔

''اتنا غصہ ٹھیک نہیں جانم'' سجاد نے ایک دم پینترا بدلا۔ بڑے پیار سے اسے سمجھانے لگا۔ ''یہ کنگن واپس نہیں ہوں گے۔ میں سیٹھ عشرت کو ناراض نہیں کر سکتا۔ وہ ایک لمحے میں میرا سنہرا مستقبل اندھی رات کی طرح اندھیرا کر دے گا۔''

عشرت نے بھی تو دانہ ہی ڈالا تھا۔ کنگن واپس نہ آئے تو رما کے حصول میں کسی دشواری کا خطرہ بھی نہیں رہے گا۔ سجاد اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن سکتا تھا اور اپنی خوبصورت بیوی کو ترقی کے لیے زینے کے طور پر استعمال کر سکتا تھا' جس کی خوبصورتی کے جال میں عشرت پہلی ہی نظر میں پھنس گیا تھا۔

رما کی مرضی اور خوشی کے بغیر ہی سجاد ہر قدم اٹھا رہا تھا۔ رما پر کئی دن ہسٹریائی کیفیت طاری رہی لیکن سجاد نے جو پلان بنائے تھے اور عشرت نے اسے جو سبز باغ دکھائے تھے' ان سے وہ ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوا۔ رما کی ہسٹریائی حالت سے وہ بالکل متاثر نہ ہوا' کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ اب وہ غیرت مند شوہر نہیں کاروباری مرد تھا۔ جہاں سے فائدے کے توقع تھی اس کی نگاہیں ادھر ہی تھیں۔ رما کے کیا احساسات تھے' وہ کیا سوچتی تھی' کیا چاہتی تھی' اسے کچھ پرواہ نہیں تھی۔ بال آخر رما چپ ہوگئی اور یہ چپ اندر ہی اندر اسے ڈھاتی رہی' بکھیرتی رہی' ادھیڑتی رہی اور بناتی رہی' بناتی رہی' ڈھالتی رہی۔ اس نے اپنی زندگی کا رخ متعین کرلیا۔ اب وہ ایک نئی رما تھی۔

کراچی آکر سجاد کی دنیا ہی بدل گئی۔

روپیہ پیسہ' خوبصورت سجا سجایا گھر' گاڑی' نوکر چاکر' سبھی کچھ مل گیا۔ اس کے لیے صرف رما کو عشرت سے دوستی ہی کرنا پڑی تھی۔

رما کے اندر کی ادھیڑ بن نے بال آخر اسے سجاد کے مطلب کے سانچے میں ڈھال ہی دیا۔ پھر بھی تابی کی پیدائش پر رما نے ایک بار پھر سمٹ سکڑ کر صرف اور صرف اپنے گھر کی ہو جانا چاہا۔ تو تکار شروع ہوگئی۔

''سجاد! ہمارے دو بچے ہو گئے ہیں۔'' وہ منت سے بولی۔ ''ہمیں ان کی پرورش اور نگہداشت پر توجہ دینی چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ وقت انہیں دینا چاہیے۔''

''سب کچھ انہی کے لیے تو کر رہے ہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے جواب دیتا۔ ''جتنا زیادہ پیسہ بنالیں گے' اتنے ہی یہ دونوں آسائش سے رہیں گے۔ ٹرینڈ آیا رکھی ہوئی ہے' وہ تم سے زیادہ اچھی طرح انہیں پال سکتی ہے۔''

''انہیں آیا کی نہیں' ماں کی ضرورت ہے۔''

''سب بیہودہ باتیں ہیں یہ۔۔۔۔۔۔۔ بچے ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

''نہیں سجاد! وہ ہماری غیر حاضری بری طرح محسوس کرتے ہیں۔ انہیں دولت کی نہیں' ہمارے پیار کی ضرورت ہے۔''

''پیار ہم ان سے کرتے ہیں۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتا رما' میں پانا چاہتا ہوں' بہت کچھ' بہت کچھ۔۔۔۔۔۔۔''

سجاد کے پاس جتنی تیزی سے دولت آرہی تھی اس کی خواہشوں میں اتنی تیزی ہی تندی اور شدت آرہی تھی۔ اسے سوائے روپے

پیسے کے اور کسی بات کے سوچنے کا شعور نہیں رہا تھا۔ وہ خوش تھا' مطمئن تھا' اس کی حصول زر کی ہوس تیز تر ہو رہی تھی۔

کراچی میں میدان وسیع تھا۔ یہاں ایک عشرت نہیں' کئی عشرت تھے جو اس کا ہاتھ تھامنے کو صرف اس لیے تیار تھے کہ حسین و جمیل تیتری بیوی کے روپ میں اس کے پاس تھی۔ اس تیتری کو چھونے اور پکڑنے کے لیے وہ ہر شے داؤ پر لگانے کو تیار تھے۔

اب تو رما بھی گناہ کے ڈھلوانی راستے پر لڑھک گئی تھی' اس نے سجاد کے آگے سر جھکا دیا تھا۔

مسلسل ضربیں لگا لگا کر سجاد نے اس کی ہیئت بدل ہی دی تھی' اس کا اخلاقی ڈھانچہ توڑ پھوڑ کر اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال ہی لیا تھا۔

دونوں اب پہلو بہ پہلو ایک ہی راہ پر چل رہے تھے۔ مخلوط پارٹیاں' ڈرنک' ڈانس' ہوٹل' کلب' بے باکیاں' بے تکلفیاں' سب زندگی کا لازمی جزو بن گئے تھے۔ حلقہ کار اور دائرہ اختیار وسیع ہو گیا تھا۔

رما کے اندر کی بھولی بھالی اور معصوم رما اندر ہی مر کھپ گئی تھی۔ اب ماڈرن اور سوسائٹی کی روح رواں رما ہی تھی' جو اپنے حلقے میں بڑی محبوب اور بڑی مقبول تھی۔

سجاد نے اپنی کنسٹرکشن کمپنی کھول لی تھی۔ کلید کامیابی رما تھی۔ کمپنی کو ٹھیکے پر ٹھیکے مل رہے تھے' لاکھوں سے کروڑوں میں پہنچ گئے تھی۔ محل نما گھر خرید لیا گیا' دو دو تین تین گاڑیاں آ گئیں' پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔

سجاد نے ایکسپورٹ اور امپورٹ کا بزنس بھی شروع کر دیا تھا۔ رما کے سہارے ہر کام ہو جاتا تھا۔ ہر پرمٹ' ہر لائسنس مل جاتا تھا۔ رما کے حسن داد کے سامنے کسی کو انکار کی جرات ہی نہ ہوتی' اس کا اشارۂ ابرو ہی کافی ہوتا۔

اپنی اس نئی زندگی سے اب رما بھی مانوس ہو چکی تھی۔

ضمیر رہا تھا نہ ضمیر کا دھڑکا۔

سجاد کی تو بات ہی اور تھی' اس نے رما کے توسط سے خوابوں کی منزل کو چھو لیا تھا۔ رما اس کے لیے دھن دولت کی دیوی تھی۔ اسے یہی چاہیے تھا۔ اس نے سب کچھ پا لیا تھا۔

ہر انسان کے اندر اس کا ضمیر ہوتا ہے' جو اچھائیوں اور برائیوں کو تولتا رہتا ہے' نیکی بدی کا موازنہ کر کے فرد کو جتلاتا رہتا ہے' اس کے سامنے لاتا رہتا ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ فرد آنکھیں بند کر لے' کانوں میں روئی ٹھونس لے اور ضمیر کی صدا کو ان سنی کر دے' دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کا حیلہ

کرے۔لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ضمیر چیخ اٹھتا ہے۔اپنے ہونے کا احساس دلانے لگتا ہے' توازن اور موازنے کے فرد پر مسلط کر دیتا ہے' پھر آنکھیں اپنے آپ کھل جاتی ہیں اور کان سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔آج کچھ یہی کیفیت سجاد کی بھی تھی۔

رما کو اس نے خود ہی اس راستے پر چلایا تھا لیکن وہ اس پر اب اتنی دور نکل گئی تھی کہ لوٹانا مشکل تھا۔شاید وہ لوٹانا چاہتا بھی نہیں تھا' لیکن آج ضمیر کے چیخنے پر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں' کان سننے پر مجبور ہو گئے تھے اس کے لیے تابی کا بخار واسطہ بنا تھا۔

سجاد نے آج رما کو روکنا چاہا تھا لیکن رما آفندی کو وقت دے چکی تھی' ڈرنک کا پروگرام تھا' ڈانس تھا' ڈنر تھا۔

رما کو بہر طور اس کاغذ پر آفندی سے دستخط کرانا تھے' جس کی وجہ سے پورے تین لاکھ کا پرافٹ ہو رہا تھا۔یہ بات وہ کیسے جھٹلا سکتی تھی' موقع کیسے گنوا سکتی تھی۔

سجاد تو خواہ مخواہ بچے کے معمولی بخار سے جذباتی ہو گیا تھا۔وہ بچے کی پرواہ کئے بغیر چلی گئی تھی اور اب جب وہ آفندی سے دستخط شدہ کاغذ لے کر رات کے ڈھائی بجے واپس آئی تھی تو سجاد کے اندر کا مرد جاگ اٹھا تھا۔اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔کان سننے کے قابل ہو گئے تھے۔

وہ پستول سے اس عورت کو شوٹ کر دینا چاہتا تھا' جو شراب اور نیند کے خمار میں ڈوبی' بیڈ پر بے ترتیبی سے پڑی تھی لیکن وہ پستول نہ چلا سکا' کوئی فیصلہ کن لمحہ اس کے اندر چیخ اٹھا۔

فیصلہ کن لمحہ چیخا۔۔۔۔۔۔

سجاد! گولی چلانے سے پہلے فیصلہ کر لو کہ یہ گولی رما کے سینے میں اترنی چاہیے یا تمہارے سینے میں۔۔۔۔۔۔؟

اسے یہاں تک لانے کا ذمہ دار کون ہے؟

قصور کس کا ہے؟

مجرم کون ہے؟

پہلے یہ فیصلہ کر لو۔۔۔۔۔۔پہلے یہ فیصلہ کر لو۔

◆◆◆

ناقابل یقین

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرا تبادلہ ساول نگر ہوا تھا۔ ان دنوں ساول نگر کے اردگرد کے دیہاتوں میں بجلی پہنچانے کا کام شروع ہوا تھا۔ اس پہاڑی علاقے میں بجلی پہنچانے کا کام سہل نہیں تھا۔ اس لیے اکثر ملازمین ادھر آنے سے گھبراتے تھے۔ تبدیلیاں رکوانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے تھے لیکن یہ خوبصورت پہاڑی علاقہ میری بیوی کو بہت پسند تھا۔ چیڑ کے درختوں کی بہتات تھی۔ پھول اور سبزے سے کالی' سرمئی' نارنجی اور مٹیالی پہاڑیاں ڈھکی تھیں' جگہ جگہ قلقل کرتے چشمے تھے۔ برساتی ندی نالے بھی کثرت سے تھے۔ قدرت کا حسن یہاں نکھرا نکھرا تھا۔ یہ علاقہ ناپسند مجھے بھی نہیں تھا۔ لیکن میرا کام جس نوعیت کا تھا یہاں رہنے میں خاصی دقت اور دشواری بھی تھی۔ ہفتے میں دو دفعہ تو ضرور ہی قریبی شہر میں جانا پڑتا تھا۔ گھریلو ضروریات کی چیزیں بھی لانا ہوتیں اور دفتر کا ڈھیروں سامان بھی ڈھونا پڑتا۔ کبھی کبھی میری چہیتی بیوی انیسہ بھی میرے ساتھ جاتی۔

لیکن ننھے عاصم کی وجہ سے ہر دفعہ انیسہ میرے ساتھ نہیں جاسکتی تھی اور مجھے یہ سفر اکیلے ہی کرنا پڑتا تھا اس لیے یہ سفر مجھے خوشگوار نہیں لگا کرتا تھا۔ گو راستہ خراب نہیں تھا' سڑک بھی بہت اچھی تھی اور پہاڑ کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ ایک طرف ہریالی اور سبزے سے ڈھکے پہاڑ اور دوسری طرف گہری کھائیاں تھیں۔ یہ کھائیاں بھی سبزے اور پھول دار جھاڑیوں سے پٹی تھیں۔ کہیں کہیں عمیق ڈھلانیں بھی آتی تھیں اور کہیں چٹانیں عمودی بھی ہوجاتی تھیں۔ جب انیسہ یا دفتر کا کوئی آدمی ساتھ ہوتا تو یہ راستہ بڑا خوبصورت لگتا۔ باتوں باتوں میں وقت گزر جاتا۔ ذرہ بھر بھی بوریت نہ ہوتی لیکن اکیلے میں یہ سفر مجھے کبھی نہ بھاتا۔ مجھے اکتاہٹ اور بے زاری کا احساس مسلسل ستاتا۔ ایسے میں اکثر گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے کسی سرسبز ڈھلان پر بیٹھ جاتا اور قدرت کے بے پناہ حسن سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا۔

اس دن بھی میں کچھ دیر ستانے کی غرض سے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے ایک ڈھلانی چٹان کے سرے پر آ کر بیٹھ گیا۔ بڑے سے کالے پتھر سے ٹیک لگا کر میں نے سگریٹ سلگایا اور تساہل سے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے قدرت کے بے بہا حسن کے خزینوں سے لطف لینے لگا۔ اس وقت مجھے انیسہ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ انیسہ جب میرے ساتھ ہوتی تو موسم اور ماحول کچھ زیادہ ہی گل رنگ ہوجایا کرتا تھا۔ وہ بہت باتونی اور شوخ تھی۔ اس کی ہنسی کی پھواریں بڑی دلنشیں ہوا کرتی تھیں۔ شاید اس کا من

بہت خوش تھا۔ اس لیے وہ بھرپور قہقہے بکھیرا کرتی تھی۔ زندگی اسے پھولوں بھری شاخ لگتی تھی۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے بڑی مطمئن اور خوش تھی۔ ساول نگر آ کر تو وہ اور بھی زیادہ خوش تھی۔ خوبصورت پہاڑی علاقے میں ہمیں لکڑیوں کا چھوٹا سا کاٹیج مل گیا تھا۔ یہ کاٹیج سدا بہار پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز اس میں موجود تھی۔ شاید ہمیں اتنی جگہ یہاں نہ مل پاتی' لیکن ساول نگر کے رئیس اعظم فرزند علی خان کی بڑی بیٹی انیسہ کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ وہ بھی انیسہ کے ساول نگر آنے سے بہت خوش ہوئی تھی اور اسی نے اپنے بااثر والد سے کہہ کر یہ حسین اور پیارا سا گوشہ عافیت ہمیں دلا دیا تھا جسے نمونہ فردوس بنانے میں انیسہ کے حسن ذوق اور محنت نے بڑا کام کیا تھا۔

فرزند علی خان اس علاقے کے رئیس اعظم تھے۔ دو ہی بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی جو انیسہ کی کلاس فیلو تھی اپنے چچا زاد سے بیاہ کر اپنے ہی گھر میں ٹھہری ہوئی تھی۔ چھوٹی بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکہ گئی ہوئی تھی۔ ہمارے یہاں آنے سے وہ لوگ بھی بہت خوش تھے۔ انیسہ کی دوست رابعہ جو باپ کی محل نما حویلی میں رہتی تھی' انیسہ کے آنے سے کچھ زیادہ ہی مسرور تھی۔

''انیسہ! تم یہاں آ گئی ہو تو لگتا ہے میں اکیلی نہیں رہی۔''

''فریحہ کے امریکہ جانے کے بعد میں اس کی کمی شدت سے محسوس کرتی تھی۔''

''میرے میاں بھی تو اکثر باہر ہی رہتے ہیں' اس لیے تنہائی بے حد کھلتی ہے۔''

''ابا بے چارے تو مجھے کمپنی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں' لیکن میں ان سے اس طرح تو فری نہیں ہو سکتی نا۔''

''تمہارے ساتھ تو دل کی ساری باتیں کر سکتی ہوں۔''

''فارغ ہو کر آ جایا کرو میرے پاس۔''

''عاصم کو بھیج دیا کرو' میں اسے اچھی طرح رکھا کروں گی' بچے تو میری جان ہیں۔''

''میں بھی تمہارے ہاں آیا کروں گی' فکر نہ کرو' تنگ آ جاؤ گی مجھ سے۔''

وہ ایسی ہی باتیں انیسہ سے اکثر کہتی اور انیسہ اس کی ایک ایک بات مجھے بتا دیا کرتی۔ اس طرح شاید وہ مجھے مرعوب بھی کرنا چاہتی تھی کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی میری کتنی قریبی دوست ہے یا شاید اس کا اپنا ہی کوئی احساس تسکین پاتا تھا۔ بہرحال میں ان دونوں کی دوستی میں حائل نہیں ہوا تھا اور رابعہ بھی سمجھدار تھی۔ میری عدم موجودگی میں وہ انیسہ کے پاس آ جاتی تھی یا انیسہ اس کے ہاں چلی جاتی تھی۔ میں گھر پر ہوتا تو نہ ہی وہ آتی نہ ہی انیسہ اس کے ہاں جانے کی بات کرتی۔ ہاں' جب ان کے ہاں کوئی بڑی دعوت یا

تقریب ہوتی تو پھر ہم دونوں اکٹھے ہی ان کے ہاں جاتے۔ ان کی وساطت سے ہی اس علاقے کے اچھے اچھے با اثر مقتدر لوگ ہمارے دوست بن گئے تھے۔ یوں نئی جگہ پر آ کے ہمیں قطعاً اجنبیت کا احساس نہیں تھا۔

اس وقت میں ڈھلان پر پاؤں پسارے سگریٹ کے کش پہ کش لگاتے انہی لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انیسہ یقیناً اس وقت رابعہ کے ہاں ہوگی یا رابعہ ہمارے ہاں آئی ہوگی۔ دونوں گپ شپ لگا رہی ہوں گی۔ بات بات پہ کالج کے زمانے کا ذکر ہوگا' سہیلیوں کے قصے ہوں گے' جنہیں کئی کئی بار وہ پہلے بھی دہرا چکی ہوں گی۔ اچھا ہوتا جو آج انیسہ میرے ساتھ آ جاتی۔ تیارہ تو وہ ہوئی تھی لیکن عین وقت پر عاصم نے چھینکنا شروع کر دیا تھا۔ مبادا اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے' یہ سوچ کر انیسہ نے پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔

''آپ ہی جایئے جناب' ہمارے منے میاں نے ہمیں روکنے کے احکامات صادر فرما دیئے ہیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''ہاں جی' منے میاں کے سامنے ہماری کیا حیثیت۔۔۔۔۔۔۔'' میں نے بھی شوخی سے انیسہ کے گال پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔'' اس نے منے کو ساتھ چمٹا لیا تھا اور اس کی اس ادا پر میں نے بے ساختہ اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر دبوچ لیا تھا۔

انیسہ نہیں آئی تھی اور میں نے دفتر کی چیزیں خریدنے میں کئی گھنٹے لگا دیئے تھے۔ یہ انتہائی تھکا دینے والا کام تھا۔ ایک ایک چیز کے لیے کئی کئی دکانوں پر جانا پڑتا تھا۔ عاصم اور انیسہ کی بھی کچھ چیزیں لی تھیں' ان کے لیے بھی مجھے پوری مارکیٹ کے دو چکر لگانا پڑے تھے۔

گھر کے لیے روانہ ہونے میں مجھے دیر ہو گئی تھی۔ عام طور پر میں تین چار بجے تک واپس گھر پہنچ جایا کرتا تھا لیکن آج تو تین مارکیٹ ہی میں بج گئے تھے۔

اور

اب

جب میں چٹان پر نیم دراز تھا' میں نے آستین ہٹا کر گھڑی دیکھی تو چار بج کر پینتالیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں زیادہ راستہ کاٹ چکا تھا۔ اب تیس بتیس منٹ کی ڈرائیو تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے میں گھر پہنچ سکتا تھا۔

اوپر تلے تین سگریٹ پینے کے بعد میں کچھ تازہ دم ہو گیا تھا۔ فطرت کے بے پناہ حسن نے بھی تکان دور کر دی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا' کپڑے جھاڑے' سوکھی گھاس کے تنکے لیٹنے سے کپڑوں سے چمٹ گئے تھے۔

نیا سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔

اور

لائٹر جلا کر سگریٹ سلگانے لگا لیکن سگریٹ سلگنے سے قبل ہی ایک نسوانی چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ ہونٹوں میں دبے سگریٹ اور ہاتھ میں جلتے لائٹر سمیت میں نے ایکا ایکی گھوم کر دیکھا۔

مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ اسی اثناء میں دو ایک گاڑیاں زن سے سڑک پر سے گزر گئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ چیخ کی آواز انہی میں سے کسی ایک گاڑی میں سے آئی ہوگی' اس لیے آرام سے پھر لائٹر جلایا۔

''ہائے ۔۔۔۔۔ کوئی بچائے ۔۔۔۔۔۔ کوئی ۔۔۔۔۔۔ بچائے مجھے ۔۔۔۔۔۔۔ آں ۔۔۔۔۔۔۔ اوئی ۔۔۔۔۔ اللہ ۔۔۔۔۔۔'' میری پشت پر سے یہ نسوانی چیخ کی آوازیں ابھریں' تو میں ایک دم مڑا۔

''اوہ ۔۔۔۔۔۔۔ میرے خدا ۔۔۔۔۔۔۔'' میرے منہ سے سگریٹ گر پڑا۔ میں بے اختیار ادھر کو بھاگا۔

''بچاؤ ۔۔۔۔۔۔۔ بچاؤ ۔۔۔۔۔۔۔'' وہ چیخ رہی تھی۔

میں نے دیکھا۔

اور

چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

عمودی چٹان نیچے سے قدرے ڈھلوان تھی۔ درختوں جھاڑیوں اور خودرو جھالر دار گل رنگ پودوں سے پٹی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے چٹان کے سڑک والے سرے پکڑ رکھے تھے اور عمودی حصے پر لٹک رہی تھی۔ اس کے پاؤں ڈھلان سے کوئی دس فٹ اوپر تھے' یوں وہ پتھریلی چٹان کے ساتھ لگی بڑی حد تک ہوا میں معلق تھی۔ گر جانے کے خوف نے اس کے حواس کو بکھیر کر رکھ دیا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے چیخے جا رہی تھی۔

میں جلدی سے لپکا۔

اور

اس کی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر اسے اوپر کھینچنے کی کوشش کی۔

''اوہ ۔۔۔۔۔۔۔ آ ۔۔۔۔۔۔۔'' اس کے منہ سے بے ترتیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

''پاؤں پتھروں میں اٹکانے کی کوشش کیجئے' میں آپ کو اوپر کھینچ لوں گا' گھبرایئے نہیں'۔۔۔۔۔۔۔ہمت سے کام لیجئے۔''میں نے ہانپتے ہوئے اسے کھینچنے کی کوشش کی۔اس کی کلائیاں اب میرے ہاتھوں میں تھیں لیکن چونکہ وہ لٹک رہی تھی اس لیے اس کا بوجھ سنبھالنا میرے لیے بڑا مشکل ہو رہا تھا حالانکہ وہ دھان پان سی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اسے اوپر کھینچنے کی پوری کوشش کی۔

لیکن

اسے آسانی سے اوپر کھینچ نہ سکا۔الٹا میں خود بھی دو ایک بار نیچے گرنے لگا۔پھر بھی میں نے اپنی گرفت اس کی کلائیوں پر مضبوط رکھی اور سڑک پر ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن سڑک پر کوئی راہ گیر نظر نہ آیا جسے میں مدد کے لیے پکارتا۔

''اوہ۔۔۔۔۔۔خداوندا۔۔۔۔۔۔''میرے منہ سے پھر نکلا۔

''بچاؤ۔۔۔۔۔۔بچاؤ۔۔۔۔۔۔آں۔۔۔۔۔۔آہ۔۔۔۔۔۔''وہ بے چارگی سے چیخے جا رہی تھی۔

میں ایک دم گھٹنوں کے بل ہو گیا اور قریب پڑے بڑے سے پتھر پر اپنا پاؤں ٹکا کر پورے زور سے اسے کھینچتے ہوئے چیخا۔

''گھبرایئے نہیں' پتھروں میں پیر اٹکا کر اونچا ہونے کی کوشش کریں۔۔۔۔۔۔۔میں پورا زور لگا رہا ہوں۔''

اس نے بھی شاید کسی پتھر کا سہارا لے لیا تھا۔اب کے جو میں نے ایک جھٹکے سے اسے اوپر کھینچا تو وہ پوری کی پوری مجھ پر آن گری۔

''اوہ۔۔۔۔۔۔''وہ بے حال ہو رہی تھی۔سانس میری بھی پھول گئی تھی اور جھٹکے سے بازو بھی شل سے ہو گئے تھے۔اس لیے چند لمحے نہ وہ مجھ پر سے ہٹی نہ ہی میں نے اسے الگ کیا۔اتنی مشقت اور ذہنی اذیت کے باوجود مجھے اس کا وجود بار نہیں لگا بلکہ یوں محسوس ہوا کہ میں خوش رنگ پھولوں کے مہکتے ڈھیر تلے اچانک ہی چند لمحوں کے لیے دب گیا ہوں۔

''توبہ''اس کے منہ سے نکلا اور وہ غیر متوازن سانس لیتی جھینپ کر مجھ سے پرے ہٹ گئی۔

میں ویسے ہی پڑا رہا۔کئی لمحے یوں ہی گزر گئے۔

پھر اس نے اٹھ کر اپنا دوپٹہ کندھوں پر ڈالا اور تیز تیز سانس لیتے ہوئے بولی۔''آپ نہ ہوتے تو میری ہڈی پسلی ایک ہو گئی ہوتی۔''

میں اس کے سراپا پر ایک گہری نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بے حد حسین تھی' اس نے شوخ ریشمی لباس پہن رکھا تھا جو اس کے قیامت خیز سراپا پر بے طرح جچ رہا تھا۔

''آپ۔۔۔۔۔۔۔'' میرے منہ سے صرف یہی نکلا۔

''میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' اس نے ایک نگاہ دلفریب مجھ پر ڈالی' میں سحر زدہ ہو گیا۔ ''آپ میری مدد کو نہ آتے تو ۔۔۔۔۔۔۔توبہ۔۔۔۔۔۔۔'' وہ سرتاپا لرز گئی اور اس کی اس خوفزدگی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

میں اب بھی کچھ نہ بولا۔ بس چپ چاپ اسے تکے گیا۔

اس نے سڑک پر ایک نگاہ ڈالی پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔ ''اب میں ادھر جاؤں گی کیسے؟''

''کدھر جانا ہے آپ کو؟'' میں نے پہلی بار اپنے لب کھولے۔

''ادھر۔۔۔۔۔۔۔'' اس نے سرسبز کھائی کی دوسری طرف اشارہ کیا۔

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''ادھر؟''

''ہاں''

''ادھر سے آپ ادھر کیسے آ گئیں؟''

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ جادو کا جال تھی۔

پھر وہ کچھ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرے سب ساتھی ادھر ہیں۔''

''اور آپ۔۔۔۔۔۔۔؟''

''ہم لوگ سیر کے لیے آئے تھے۔''

''اس کھائی میں۔۔۔۔۔۔۔؟''

''یہ بہت خوبصورت لگی تو ہم نے گاڑیاں روک لیں' پھر شرط بندھ گئی کہ کھائی کے اس طرف جو جائے گا اسے انعام دیا جائے گا۔''

''اور انعام کے لالچ میں آپ کھائی پار کرنے نکل پڑیں؟''

''میں اکیلی تھوڑا ہی تھی اور ساتھی بھی تھے۔''

''وہ کہاں گئے؟''

''پتہ نہیں' ادھر ادھر سے راہیں تلاش کر کے اس پار پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔''

وہ پھر بڑے حسین طریقے سے مسکرائی تھی۔

''آپ کو تو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا ہو گا۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔ پھر جیب سے نیا سگریٹ نکال کر سلگایا اور کش لیتے ہوئے بولا۔ ''اب کیا پروگرام ہے؟''

''کیا کروں؟'' اس نے الٹا مجھی سے سوال کیا۔

''میرے خیال میں اب ادھر سے کھائی پار کر جایئے تو دوہرا انعام ملے گا۔''

''ہائے' نہیں'' وہ بڑے خوبصورت انداز میں بولی۔

''تو پھر یہیں کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کریں گی کیا؟''

وہ تذبذب کے عالم میں سر کو کبھی ''ہاں'' اور کبھی ''نہ'' کے انداز میں ہلانے لگی۔

میں نگاہ شوق اس کے سراپا پر ڈالتے ہوئے اپنے آپ کو ایک رومانوی ہیرو سمجھتے ہوئے بولا۔ ''اب کیا خیال ہے؟''

''آپ نے میری مدد کی ہے' پلیز تھوڑی سی تکلیف اور کریں۔''

''کیا؟''

''آپ کے پاس گاڑی ہے نا؟''

''یہ میری ہی گاڑی ہے۔'' میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو تکلیف تو ہو گی' مجھے وہاں تک چھوڑ آیئے۔''

''کہاں تک؟''

''جہاں ہماری گاڑیاں کھڑی ہیں۔'' اس نے کھائی کے دوسری طرف اشارہ کیا۔

وہاں اتنی دور سے گاڑیاں تو نظر نہ آ رہی تھیں' لیکن میں نے اندازہ کیا کہ مجھے پر پیچ راستوں سے ہوتے ہوئے کوئی پانچ چھ میل پیچھے جانا پڑے گا۔

''پلیز'' اس نے منت بھرے لہجے میں کہا' تو میرا دل پسیج گیا۔ میں جلدی سے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں' میں آپ کو جہاں کہیں گی پہنچا دوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ'' وہ بولی۔

''لیکن۔۔۔۔۔۔۔''

''لیکن کیا؟''

''آپ کے ساتھی ادھر آ گئے تو۔۔۔۔۔۔۔''

''ہاں' یہ بات بھی ہے۔''

''تو آپ کو یہاں نہ پا کر پریشان ضرور ہوں گے۔''

''ہوں گے تو۔۔۔۔۔۔۔''

''پھر۔۔۔۔۔۔۔؟''

وہ چند لمحے چپ رہی۔

پھر میں نے ہی کہا۔ ''کیا سب ساتھی اس خطرناک مشن پر کھڑے ہوئے تھے یا کوئی گاڑیوں کے پاس بھی رہ گیا تھا؟''

''ہاں' ہاں ہے۔۔۔۔۔۔۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ہم صرف تین لڑکیاں اور دو لڑکے یہ کھائی عبور کرنے نکلے تھے' ہمارے باقی ساتھی وہیں ہیں۔''

''پھر تو ٹھیک ہے۔''

''لے چلیں گے نا مجھے؟''

''یہ تو اب میرا فرض بن گیا ہے۔''

''مجھ پر بڑا احسان کریں گے آپ۔''

''ایسا نہ کہئے' ان حالات میں مدد کرنا میرا فرض ہے۔ ویسے آپ نے بڑی سخت حماقت کی ہے شاید آپ کو اب بھی اس کا احساس نہیں۔ میں حیران ہوں اس کھائی میں آپ اتریں کیسے اور پھر اس طرف چڑھیں کیسے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مجھے لگا کہ فضا میں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے شوخ حسینہ کو سرزنش کرنے کی کوشش کی۔ اسے ہنسنے سے روکنا مقصود نہیں تھا' بلکہ اس کی دلنشیں اور دلفریب ہنسی نے تو مجھے بے طرح محظوظ کیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ ہنستی چلی جائے اور فضا نقرئی گھنٹیوں کے ترنم سے مسحور

کن ہوتی جائے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے حسن و جمال کے شکنجے میں بنا چاہے بہت بری طرح جکڑا جا رہا ہوں۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔ ایسا بے مثال حسن میری نظروں سے آج تک نہیں گزرا تھا۔ وہ صرف حسین ہی نہیں' بے حد دلکش اور پر کشش بھی تھی۔ جیسے لوہا مقناطیس کی طرف آپوں آپ کھنچتا ہے۔ اسی طرح اس کی طرف میں بھی آپوں آپ کھنچتا چلا جا رہا تھا۔

لیکن

پیشتر اس کے کہ میرے اندر کا جوان اور رومان پسند مرد اس ساحرہ کی قربت میں بیدار ہو جاتا' میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کافر ادا سے چھٹکارا پایا جائے۔ چنانچہ میں نے قدم اٹھایا اور گاڑی کی طرف جانے کی نیت سے بولا۔ ''آیئے' میں آپ کو کھائی کے اس دوسرے سرے پر چھوڑ آؤں۔''

''بڑی جلدی ہے آپ کو۔'' وہ رسانیت سے بولی۔

میں نے پلٹ کر اسے بغور دیکھا۔ عجیب لڑکی تھی۔ ایک تو اتنے مہیب حادثے سے بمشکل بچ پائی' دوسرے ساتھیوں سے بچھڑی یہاں کھڑی تھی لیکن اسے کوئی فکر نہ تھی' یوں کھڑی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور وہ صرف مجھ سے ملنے کہیں سے آ گئی ہے۔

''محترمہ۔۔۔۔۔۔۔!'' میں نے گھڑی دیکھی۔ ''مجھے اپنے گھر بھی پہنچنا ہے' پہلے ہی لیٹ ہوں۔ اب آپ کو وہاں تک چھوڑنے میں بھی وقت لگے گا۔''

وہ پھر ہنس پڑی اور گلگوں چہرے اور مست نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''گھر پہنچنے کی جلدی کیوں ہے آپ کو؟''

میں اس کی بات سے کچھ حیران سا ہوا۔ اتنی بے تکلفی سے وہ یہ سوال کر رہی تھی' حالانکہ ہم دونوں اجنبی تھے اور ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔

''ہوں'' اس نے پھر خوبصورت مسکراہٹ اچھالی۔ ''گھر پر بیوی انتظار کر رہی ہے آپ کا؟''

''جی ہاں''

''تو آپ شادی شدہ ہیں؟''

''صرف شادی شدہ ہی نہیں بلکہ ایک بچے کا باپ بھی ہوں۔''

''او۔۔۔۔۔۔ہو''

''کیوں؟''

''پھر تو واقعی آپ گھر پہنچنے کے لیے جو بے چین ہیں' حق بجانب ہیں۔''

میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر گاڑی کی طرف بڑھا۔ وہ بھی میرے پیچھے آئی اور بولی۔

''موسم کتنا حسین ہے۔۔۔۔۔۔۔اور یہ کھائی۔۔۔۔۔۔۔دیکھئے نا' کتنی خوبصورت ہے' چیڑ اور دیودار کے درختوں سے پٹی پڑی ہے۔ پھول کتنے خوش رنگ اور دلکش ہیں۔ سورج مغرب کی سمت محوِ سفر ہے' اس کی روشنی تمازت سے خالی ہوتی جارہی ہے' اس کا یہ خالی پن اپنے اندر کتنا حسن رکھتا ہے۔''

میں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ کھائی کی طرف منہ کئے کھڑی تھی اور بڑے دل موہ لینے والے انداز میں فطرت کے بکھرے حسن کی تعریف کررہی تھی۔

''کیا آپ کو یہیں قیام کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنی خوبصورت صراحی دار گردن کو خم دیا۔ اور سیاہ حسین آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

اور

کچھ اس طرح دیکھا

کہ

میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اوپر سے آنے والی گاڑی ہارن زور زور سے نہ دیتی تو شاید اس کی آنکھوں کے حسن کی رعنائیوں میں کھویا ہی رہتا۔

میں ہارن کی آواز سے ہوش کی دنیا میں آگیا۔ میں نے کچھ گھبراہٹ سی محسوس کی' کچھ جھلایا بھی۔

یہ خوبصورت بلاخواہ مخواہ ہی مجھ پر حاوی ہوتی جارہی ہے۔ میں نے سوچا۔ مجھے جلدی اس سے پیچھا چھڑانا چاہیے۔ عجب بے باک اور بے خوف لڑکی ہے۔ اسے ذرہ بھر احساس نہیں کہ وہ یہاں بالکل اکیلی ہے اور ایک جوان مرد اس کے اکیلے پن سے فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا' گاڑی میں بہت سا سامان تھا۔ میرے برابر کی سیٹ پر وزنی ڈبے اوپر تلے رکھے تھے۔ پچھلی سیٹ کا بھی تین چوتھائی حصہ سامان کی زد میں تھا۔ تھوڑی سی جگہ سامان کو ذرا پرے کھسکا کر بنائی جاسکتی تھی۔ میں سامان ہٹا کر اس کے

لیے جگہ بنانے لگا۔ فرنٹ سیٹ کا سامان ہٹانے کی گنجائش نہیں تھی۔ ویسے بھی میں اسے اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بٹھانے سے کچھ اندر ہی اندر خائف تھا۔ میں اپنے اندر کے مرد کو تھپک تھپک کر سلانے کی غیر شعوری کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس لیے میں نے دانستہ اس کے لیے پچھلی سیٹ پر جگہ بنائی۔

''آیئے'' میں نے جگہ بنائی۔

''جی'' وہ اپنے قدموں پر گھوم کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''آیئے''

''کہاں؟''

''آپ کو وہاں جانا نہیں؟''

''کہاں؟''

''جہاں آپ کی گاڑی کھڑی ہے۔''

''اگر میرے دوسرے ساتھی ادھر آ گئے تو۔۔۔۔۔۔۔؟''

''آپ ان کا یہاں رک کر انتظار کریں گی؟''

''کرنا تو چاہیے۔۔۔۔۔۔۔ وہ یہاں آ گئے اور مجھے یہاں نہ پایا تو پریشان ہوں گے۔ آپ نے بھی تو یہی کہا تھا نا۔''

''محترمہ!''

''آپ مجھے مدیحہ کہہ سکتے ہیں۔''

''مس مدیحہ! مجھے گھر بھی پہنچنا ہے۔ اگر آپ یہاں رک کر اپنے ساتھیوں کا انتظار ہی کرنا چاہتی ہیں تو بصد شوق کیجئے' میں اجازت چاہوں گا۔ معذرت خواہ ہوں' میں یہاں رک کر۔۔۔۔۔۔۔''

''نہیں نہیں'' اس نے جلدی سے میری بات کاٹی۔ ''میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔ وہ لوگ خدا جانے کس طرف سے ادھر آئیں گے۔''

''پھر؟''

''چلئے' مجھے ادھر ہی ڈراپ کر آیئے۔'' وہ آگے بڑھی اور گھوم کر گاڑی کی دوسری طرف فرنٹ سیٹ کی طرف جانے لگی' تو میں نے

جلدی سے کہا۔

''اس سیٹ پر سامان بھرا پڑا ہے' پلیز پیچھے ہی بیٹھ جایئے۔ میں نے ادھر جگہ بنادی ہے گو کہ سامان ادھر بھی بہت ہے لیکن آپ سہولت سے بیٹھ سکتی ہیں۔''

وہ ہنس پڑی اور معنی خیز نگاہوں سے مجھے گھورتی پچھلی سیٹ پر آن بیٹھی۔ پھر جب میں اپنی سیٹ پر بیٹھا تو وہ شوخ لہجے میں بولی۔''آپ کچھ۔۔۔۔۔۔۔خوف زدہ ہیں؟''

میں جھجکا۔خفت بھی محسوس کی۔موقع واردات پر پکڑے جانے والے مجرم کی کیفیت سے دوچار ہوا' کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

مجھے تعجب ہوا' میں نے مڑ کر تو اسے نہیں دیکھا' ہاں بیک مرر میں اس کی طرف دیکھا۔

''اف میرے خدا''

میں سرتاپا لرز گیا۔

مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا' جلدی سے دوبارہ دیکھا۔خوف سے مجھ پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔

جو چہرہ مجھے مرر میں نظر آیا' وہ کسی ستر اسی سالہ بوڑھی عورت کا انتہائی بھیانک چہرہ تھا' جھریوں سے بھرا ہوا بے رونق اور بے نور چہرہ' کرخت' کھردرا اور بدصورت ترین چہرہ۔

میں نے بے اختیارانہ انداز میں رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ

وہی تھی

حسین' قاتل حد تک حسین

میں حیرت زدہ تھا' مرر میں کس کی شکل نظر آئی تھی۔

میں نے دوبارہ شیشے میں دیکھا۔

مجھے

پھر

وہی مکروہ بدصورت اور کرخت چہر نظر آیا۔

میں نے دوبارہ اور سہ بارہ دیکھا۔ شیشے میں وہی بوڑھی عورت کا بدصورت اور بھیانک چہرہ نظر آیا۔ خوف کی کپکپی سے ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی۔

میں نے پلٹ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔

وہ

وہی تھی

تو پھر شیشے میں اس کا عکس کیوں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھیانک چہرہ کس کا تھا جو شیشے میں دکھائی دیتا تھا۔

''اب چلئے بھی۔۔۔۔۔۔۔'' اس نے مترنم لہجے میں کہا۔ ''کیا مسئلہ ہے گاڑی کیوں نہیں چلا رہے؟ کہیں گاڑی خراب تو نہیں ہو گئی؟''

''نہیں۔۔۔۔۔۔۔نہیں تو۔۔۔۔۔۔۔'' میں نے لرزتے ہاتھوں سے چابی گھمائی اور گاڑی سٹارٹ کر کے میں نے پھر ڈرتے ڈرتے نگاہ شیشے پر ڈالی۔ اب وہ شیشے میں مسکرا رہی تھی۔ میری نگاہ اس کی نگاہوں سے ملی' وہ پھر مسکرا دی۔ میں نے بلا ارادہ پلٹ کر اسے دیکھا۔

میرا دماغ چکرا گیا۔

سیٹ پر وہ نہیں تھی' بلکہ وہ بوڑھی مکروہ شکل عورت براجمان تھی' جس کا چہرہ مجھے بار بار آئینے میں نظر آیا تھا۔

میرے ہاتھوں میں اسٹیرنگ گھوم گیا اور گاڑی سڑک سے عین چٹان کے کنارے پر آ گئی۔

''اے ہے' کیا کر رہے ہیں؟'' اسٹیرنگ کو اس کے خوبصورت ہاتھوں نے پکڑ لیا۔ اس کے بازو میرے کندھوں سے چھو گئے' وہ پوری پوری مجھ پر جھک آئی تھی۔ وہ گاڑی کنٹرول نہ کرتی تو یقیناً بھیانک حادثہ ہو جاتا۔ گاڑی رک گئی۔

پتہ نہیں' گاڑی میں نے روکی یا اس نے۔ بہرحال گاڑی ایک عمودی چٹان کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ میں حواس باختہ سا تھا اور وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بازو میرے کندھوں سے بھی آگے نکلے ہوئے تھے اور اس نے اسٹیرنگ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

میں نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے بازوؤں پر آ گئے۔ میں نے اس کی کلائیوں کو پکڑے پکڑے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

میری چیخ نکل گئی۔

مجھ پر وہ حسینہ نہیں بلکہ وہ مکروہ صورت چڑیل جھکی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں سختی سے میچ لیں اور ہاتھ بے ساختہ چہرے پر رکھ لیے۔ میرا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' مجھے اس کی خوبصورت آواز سنائی دی تو میں نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کے آنکھیں کھول دیں۔ وہ گاڑی سے باہر تھی اور میری طرف کے دروازے پر جھکی مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

وہ بڑے حسین انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو کیا ہو رہا ہے؟''

''پتہ نہیں' کیا ہو رہا ہے۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے پچھلی سیٹ کی طرف مڑ کر دیکھا۔

بدحواسی کے عالم میں میرے منہ سے پہلے سے بھی زیادہ زوردار چیخ نکل گئی۔ میں نے بے اختیارانہ گاڑی کی کھڑکی پر رکھا اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔ میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میں پاگلوں کی طرح پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کر کے اس کی توجہ اس طرف مبذول کرا رہا تھا۔ میں سرتاپا کانپ رہا تھا۔

''وہ۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔'' میں جیسے میلوں دوڑنے کے بعد ہانپ رہا تھا۔ فرط حیرت وخوف سے میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔

''کیا؟'' اس کی آواز آئی۔

''وہ۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔ پیچھے۔۔۔۔۔۔۔'' میں نے دھک دھک کرتے دل کو ہاتھوں سے تھامنے کی کوشش کی' سوکھے حلق کو تھوک نگل کر تر کرتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔

''اوہ میرے خدا''

میں نیم بے ہوش سا ہو گیا۔

پہلے پچھلی سیٹ پر اسی مکروہ عورت کا کٹا ہوا سر رکھا دیکھا تھا۔

اور

اب

وہاں سر کے بجائے تازہ کٹا ہوا بچھڑا پڑا تھا' جس کی گردن سے خون نکل رہا تھا اور چاروں ٹانگیں اکڑی ہوئی تھیں۔

اس نے گردن اندر ڈال کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ پھر بڑے انداز دلربائی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہے وہاں۔۔۔۔۔۔؟''

''بچھ۔۔۔۔۔۔بچھ۔۔۔۔۔۔بچھڑا۔۔۔۔۔۔'' میں خوف زدہ تھا۔

''کیا۔۔۔۔۔۔بچھڑا۔۔۔۔۔۔کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔۔۔۔؟'' وہ پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

میں نے اس کا ہاتھ ابھی تک اپنے ہاتھ تلے دبا رکھا تھا۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ اس طرح جل رہا ہے جس طرح دہکتا ہوا کوئلہ پکڑنے سے ہاتھ جلتا ہے۔

میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ کے اوپر سے اپنا ہاتھ ہٹا کر اپنی ہتھیلی دیکھی۔ میری ہتھیلی پر چھالا سا ابھر آیا تھا۔ میں اب تو بالکل ہی بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

وہ کھڑکی میں جھکی اسی طرح کھڑی تھی۔

چند لمحے جانے کتنی صدیوں کا روپ دھارے گزر گئے۔ میں حواس باختہ تھا۔ نہ منہ سے آواز نکل رہی تھی' نہ ہی کانوں میں کوئی آواز اتر رہی تھی۔ صرف آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھلی تھیں اور یہ آنکھیں صرف اسی پر مرکوز تھیں۔

وہ مسکرائے جا رہی تھی۔

کئی لمحوں کے بعد میری سماعت جب آواز کا اثر لینے کے قابل ہوئی تو میں نے سنا' وہ کہہ رہی تھی۔ ''حد ہو گئی چھ فٹ لمبے اور انتہائی صحت مند آدمی پر بھی خوف طاری ہو سکتا ہے۔''

میں نے پلکیں جھپکیں' میرے پتھرائے ہوئے چہرے میں کچھ زندگی کی لہر دوڑی۔ میں نے اپنی بانہیں ہلائیں' ہاتھ کھولے اور بند کئے۔

وہ سارا وقت مسکراتے ہوئے اسی طرح جھکی کھڑی رہی۔

''میں جاؤں؟'' وہ مجھے قدرے نارمل ہوتے ہوئے دیکھ کر بولی۔

''کہاں؟''

''وہاں''

''وہاں؟''

''ہاں' کھائی کے پار جہاں آپ مجھے چھوڑنے جا رہے تھے۔''

میں نے لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لیے' پھر ہولے سے کہا۔''پچھلی سیٹ پر۔۔۔۔۔۔۔؟''

''کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔آپ کا واہمہ ہے۔''وہ بولی۔

میں نے مڑ کر دیکھا' واقعی وہاں کچھ نہیں تھا۔میں نے دوبارہ مڑ کر دیکھا' سیٹ خالی تھی۔مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔

''کیوں؟''اس نے دلفریب ادا سے مجھے دیکھا۔

میں نے یوں ہی سر ہلایا' وہ مکروہ صورت بوڑھی عورت؟

اس کا کٹا ہوا سر؟

اور

پھر

کٹا ہوا پورے کا پورا ڈھڑ؟

سب میرے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بنے تھے۔میں نے پورے ہوش وحواس میں یہ سب کچھ دیکھا تھا' یہ واہمہ کسی طور نہیں تھا۔

''کیا ارادہ ہے اب؟''اس نے پوچھا۔

''کیا؟''میں بولا۔

''چھوڑنے جائیں گے وہاں تک۔۔۔۔۔۔۔یا میں خود چلی جاؤں؟''

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ٹکر ٹکر اسے تکے گیا۔مجھے لگا' اس کا چہرہ کچھ بدل سا گیا ہے۔اس کا لباس بھی اب وہ نہیں تھا جو اس نے پہلے پہن رکھا تھا۔

خوف کی ایک لہر سی میرے وجود میں دوڑ گئی۔میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

''میں خود ہی چلی جاؤں؟''وہ بولی۔

میں پھر پتھرا سا گیا۔کوئی جواب نہ دے سکا۔

''اچھا۔۔۔۔۔۔۔میں چلتی ہوں۔'' وہ مسکرائی' اب اس کا چہرہ پورے کا پورا بدل چکا تھا۔ مسکراتے وقت اس کے پورے کے پورے دانت لمبے ہو گئے تھے اور آنکھیں بھونڈی سی لگنے لگی تھیں۔

''مدیحہ!'' میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔

وہ کھڑکی سے پرے ہٹ گئی۔

''میں جا رہی ہوں۔۔۔۔۔۔۔یہاں تک لانے کا بہت بہت شکریہ''

''میں۔۔۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔۔۔''

وہ کھڑکی سے ہٹ چکی تھی۔ پتہ نہیں کیسے میں دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔

میں سڑک کے اس کنارے پر تھا اور وہ سڑک پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

اب وہ

وہی تھی۔

پہلی والی انتہائی حسین لڑکی' جس نے بے حد خوبصورت ریشمی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ میں پھر گڑبڑا گیا۔ میرا سر گھومنے لگا اور میں نے گاڑی کے کھلے دروازے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اس نے مجھے ہاتھ ہلایا۔

اور

پھر

وہ ایک دم ہی لمبی ہونے لگی۔

اتنی لمبی

کہ

دیودار کے تیس چالیس فٹ اونچے درخت سے بھی لمبی ہو گئی۔

میں سکتے کے عالم میں ویسے ہی کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔

وہ

ایک دم ہی درخت کے ساتھ جھول گئی اور۔۔۔۔۔۔۔اور دوسرے لمحے کھائی کے پار سڑک پر جا پہنچو۔

''اب بیٹھ بھی چکو۔''

کسی نے یہ کہا۔

تو میں نے سکتہ ٹوٹا محسوس کیا' سر گھما کر دیکھا۔

تو

میری پھر چیخ نکل گئی۔

وہ بوڑھی مکروہ وہ عورت اپنا کٹا ہاتھ ہتھیلی پر لیے کھڑی مجھ سے کہہ رہی تھی۔''اب بیٹھ بھی چکو۔''

پچھلی سیٹ پر کٹا بچھڑا اب بھی پڑا تھا۔

پھر

میرے چاروں طرف قہقہے بکھر گئے۔یہ قہقہے کھائی سے اٹھ اٹھ کر چٹانوں سے ٹکرانے لگے۔

اور

مجھے ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

جب

مجھے ہوش آیا تو میں ساول نگر کے سول اسپتال کے ایک کمرے میں تھا۔

میری بیوی انیسہ پریشان حال مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔اور میرے کئی ملنے والے کمرے میں موجود میرے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

میں بے حد نقاہت محسوس کر رہا تھا۔بمشکل میرے منہ سے نکلا۔''میں کہاں ہوں؟''

''شکر خداوند تیرا'' کوئی جواب دینے سے پہلے انیسہ کے منہ سے نکلا اور پھر میرے دو تین دوست بیڈ کے قریب آ گئے۔وہ میرے ہوش میں آجانے سے سکون محسوس کر رہے تھے۔

پھر

ڈاکٹر آ گیا۔اس نے مجھے کوئی انجکشن لگایا اور انیسہ سے کہا۔''ان سے باتیں کیجئے' اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

شام کو مجھے بخار نے آلیا۔

مجھے بتایا گیا کہ میں سڑک کے کنارے گاڑی کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔ ساول نگر آنے والے میرے کسی واقف کار نے مجھے دیکھ لیا۔ گاڑی روکی تو مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ جب کسی طور ہوش نہ آیا تو اسپتال لے آیا۔ میری گاڑی اس کے ساتھی نے ڈرائیو کی اور میرے گھر پہنچادی۔

میں ساری رات بے ہوش رہا۔ میری بیوی کی پریشانی حق بجانب تھی۔

مجھے کئی دن بخار آتا رہا۔

میرے حواس پر خوف طاری رہا۔

اور

میں نارمل نہ ہوسکا۔

انیسہ نے میری دن رات خدمت کی۔ میرے دوستوں نے بھی حق دوستی ادا کیا۔

میں نے اپنی روداد ان سب کو سنائی تھی۔ شاید وہ بھی یہ سب میرا واہمہ ہی سمجھتے لیکن میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کچھ کھچڑی بالوں کے گچھے' چند خون کے دھبے اور جگہ جگہ لگا گوبر دیکھ کر وہ بھی پریشان ہوگئے تھے۔ میری باتوں کی تصدیق ان چیزوں سے ہوجاتی تھی۔

مجھے ہفتہ بھر بخار آتا رہا۔ دواؤں کے علاوہ دعائیں بھی ہورہی تھیں۔ مسجد کے حافظ صاحب دم کرکے پانی بھی پلا رہے تھے۔ انیسہ ہمہ وقت قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر پھونکتی تھی۔

بخار اترا تو مجھے اسپتال سے چھٹی مل گئی تھی۔ میں گھر آگیا۔ لیکن بے حد نقاہت محسوس ہوتی تھی۔ ذہن پر اب بھی خوف مسلط تھا جو واقعہ پیش آیا تھا' وہ یاد آتا تو اب بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ کئی دن اسی طور گزر گئے۔ دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ انیسہ ہر وقت میرے ساتھ ہوتی۔ ننھا عاصم بھی قلقاریاں مارتا رہتا۔

میں آہستہ آہستہ سنبھلنے لگا اور ذہن پر جو خوف کی برف تھی' وہ آہستہ آہستہ پگھلنے لگی۔

چھٹی گزارنے کے بعد میں نے دفتر جانا شروع کردیا۔ یہاں اس واقعے کا اتنا تذکرہ ہوا کہ اس کی خوف زدہ کردینے والی کیفیت دم توڑ گئی۔ اب تو یار دوست اس واقعے کے رابطے سے مذاق بھی کرنے لگے۔

''اس خوبصورت بلا کو پکڑ ہی لاتے' ہمارے ہی حوالے کردیتے۔'' وہ مجھے چھیڑتے۔

''یار! تم نے تو حد ہی کر دی' عورتوں کو بھی مات کر دیا۔ اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ جان کے لالے پڑ گئے۔''

''جنات ہیں' یہ ہمارا ایمان ہے' چلو کسی جن بچی نے تم سے دل لگی کر لی تو کیا ہوا' تم تو بزدلی کی ہر حد پھلانگ گئے۔''

''واہ بھئی' اشرف المخلوقات ہو کر بھی اس بلا سے خائف ہو گئے۔''

دوستوں کی باتوں سے اب میں ڈرنے کی بجائے محظوظ ہوتا تھا۔ اکثر سوچتا تھا کہ واقعی اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔ وہ یقیناً جنات کے قبیلے سے رہی ہو گی۔ اس نے اپنے کئی روپ مجھے دکھائے تھے۔۔۔۔۔۔۔ تو کیا ہوا۔''

لیکن

سوچنے اور سمجھنے کے باوجود میرے اندر خوف تھا۔ اس لیے اب میں شہر اکیلے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب بھی جانا ہوتا' انیسہ یا دفتر کا کوئی آدمی ضرور ساتھ ہوتا۔

تین ماہ گزر گئے۔

اب میں بالکل ٹھیک تھا۔

اور

معمول کے کاموں میں الجھ گیا تھا۔ دفتر سے تھکا ہارا گھر آتا تو انیسہ کی محبت بھری مسکراہٹ اور عاصم کی معصوم ہمک میری ساری تکان دور کر دیتی۔ انیسہ چائے پلاتے ہوئے حسب عادت اور حسب معمول دن بھر کی کارکردگی میری گوش گزار کرتی۔

''آج میں وہاں گئی۔''

''میں نے شاپنگ کی۔''

''تمہاری پسند کا سوٹ خریدا۔''

''رابعہ کے ہاں دن گزارا۔''

''میری دوسری سہیلیاں آج سارا دن میرے گھر پر ہی رہیں۔''

''بڑا لطف آیا۔ آج ہم نے رابعہ کے ہاں بیڈمنٹن کھیلی۔ میں نے سب کو ہرا دیا۔''

''عاصم نے آج بہت تنگ کیا۔''

''آج عاصم کو رابعہ اپنے ہاں لے گئی تھی' ابھی ابھی واپس بھجوایا ہے اس سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔''

وہ باتیں کئے جاتی اور میں مسکرا مسکرا کر سنے جاتا۔ ہماری معمول کی زندگی پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

اس دن میں دفتر سے واپس لوٹا' تو انیسہ میرے اندر آتے ہی بولی۔ ''پتہ ہے آپ کو۔۔۔۔۔۔۔؟''

''کیا؟''

''رابعہ کی بہن آ گئی ہے۔''

''بہن؟''

''ہاں' وہ جو باہر پڑھنے کے لیے گئی ہوئی تھی' وہ آ گئی ہے۔''

''اچھا''

''اس کے آنے کی خوشی میں یہ لوگ بہت بڑی دعوت کا اہتمام کر رہے ہیں۔''

میں ہنس کر بولا۔ ''اسی لیے تم اتنی خوش ہو؟''

''بیشک۔۔۔۔۔۔۔ان کے ہاں کی دعوتیں۔۔۔۔۔۔۔واہ وا۔۔۔۔۔۔۔''

''یقیناً تمہیں اس دعوت کے لیے نئے کپڑے بھی درکار ہوں گے۔''

''بالکل۔۔۔۔۔۔۔کوئی ایسے ویسے۔۔۔۔۔۔۔ایک دم بہت خوبصورت اور بڑھیا قسم کے۔۔۔۔۔۔۔ہم کوئی کسی سے کم ہیں کیا؟''

''جی ہاں' بالکل نہیں۔''

وہ بڑے پیار سے مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔

میں صوفے پر آرام سے لیٹ گیا۔ وہ جھک کر میرے قریب جوتے اتارنے لگی۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کئے گئی۔ رابعہ کی بہن کی باتیں' رابعہ کی باتیں' ان کے خاندان کی باتیں۔

''چائے بھی ملے گی یا صرف باتیں ہی سنائے جاؤ گی آج؟'' میں نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے کہا۔

''ابھی لائی۔'' وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

میں نے کپڑے بدلے اور پھر بیڈ پر آیا۔ تکیے کے سہارے کمر ٹیک کر پاؤں پسار لیے اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا میگزین دیکھنے لگا۔ خلاف معمول عاصم اس وقت سو رہا تھا۔ اس لیے اس کے بجائے میں میگزین دیکھنے لگا۔

رابعہ کی بہن کی آمد کی خوشی میں دعوت کا اہتمام بڑے بھرپور انداز میں ہوا تھا۔ دعوتیں تو اس محل نما حویلی میں ہمیشہ ہی شاندار ہوتی تھیں۔ لیکن یہ استقبالیہ دعوت بے حد شاندار تھی۔ وسیع و عریض چمن میں رنگا رنگ روشنیوں کا نور پھیلا ہوا تھا۔ سبز اور ہموار گھاس پر جگہ جگہ آرام دہ نشستیں کے سامنے قالین پڑے تھے۔ ارغوانی قالین اور سبز گھاس۔ ان پر روشنیوں کی پھوار قابل دید تھی۔ ایک چمن میں بیٹھنے کا انتظام تھا اور دوسرے میں کھانے کا۔ وہاں میزیں لگائی گئی تھیں۔ اجلی اجلی چادریں پڑی تھیں۔ ان پر اور نازک کراکری اور نفیس چاندی کی کٹلری سجی ہوئی تھی۔ ہر میز پر خوش رنگ پھولوں کے گلدستے پڑے تھے۔

مہمان بھی بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آ رہے تھے۔ عورتوں کے لباسوں کی خوبصورت سرسراہٹیں جیولری کی کھنک چھنک میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ مردوں نے بھی ڈنر سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ فضا میں پرفیومز کی مہک رچی ہوئی تھی۔

انیسہ عورتوں کی طرف چلی گئی۔ جگہ مخصوص تو نہ تھی' ویسے ہی عورتیں بے تکلفانہ باتیں کرنے کے لیے لان کے جنوبی حصے میں بچھی کرسیوں پر جا بیٹھی تھی۔ ان کے قہقہوں کی پھوار بڑی مترنم تھی اور جب بھی یہ پھوار بارش کے سے زور شور سے برستی' آنکھیں بے اختیارانہ ان کی طرف اٹھ جاتیں۔ میں اپنے چند ایک ملنے والوں کے درمیان جا بیٹھا تھا۔ اشفاق صاحب مجھے آج ہی ملے تھے اور شومئی تقدیر کہیے کہ انہیں تین ماہ قبل میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا آج ہی پتہ چلا تھا۔ انہیں تجسس اور کریدلگی تھی' اس لیے میرے قریب آ بیٹھے تھے اور بار بار سوال کر رہے تھے۔

میں اگرچہ اس خوف سے نکل چکا تھا' جو اس واقعے نے مجھ پر کئی دن مسلط رکھا تھا پھر بھی میں اس کی یاد سے گریزاں تھا۔ جب بھی یہ واقعہ یاد آتا' میری حالت عجیب سی ہو جاتی تھی۔ لاشعوری طور پر میں اب بھی خوفزدہ تھا شاید۔

باتیں ہو رہی تھیں۔

اشفاق صاحب کے سوالوں کے جواب میری بجائے میرے ساتھی ہی دے رہے تھے۔ عجیب و غریب باتیں شاید جھٹلائی بھی جاتیں' لیکن گاڑی میں پڑے بال' خون کے دھبے' اور گوبر کے نشان تصدیق کے لیے کافی تھے۔ میرا ایک کولیگ ہی ان دلائل سے اشفاق صاحب کو قائل کر رہا تھا۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک طرف سے خواتین کی باتوں کی آوازیں قریب آتی محسوس ہوئیں۔ باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سب اس طرف متوجہ ہو گئے۔

انیسہ بھی ان میں تھی' رابعہ بھی اور حنا عاطف بھی۔

اور

انہی کے درمیان

وہ بھی تھی

پیشتر اس کے کہ میں خوف کے مارے چیخ اٹھتا' رابعہ آگے بڑھی اور بولی۔ ''میری بہن ملیحہ سے ملئے۔''

''ملیحہ یا مدیحہ؟'' میرے منہ سے بے اختیارانہ نکلا۔

''ملیحہ جناب' مدیحہ نہیں۔'' وہ بڑی رسانیت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

اشفاق صاحب ان کے جاننے والے تھے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا' دعا دی اور خیر وعافیت دریافت کرنے لگے۔

انیسہ میری حالت سے بے خبر تھی' آگے بڑھ کر مجھے کہنی مارتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ''اٹھ کھڑے تو ہو جائیں' عورتوں سے ملنے کے آداب بھی بھول گئے؟''

میں بلا ارادہ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

لیکن

میں سرتاپا کانپ رہا تھا۔ دل اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا اور آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اس مدیحہ اور اس ملیحہ میں ذرہ بھر بھی فرق نہ تھا۔ وہی چہرہ' وہی قدوقامت وہی بال' وہی آنکھیں اور وہی مسحور کن مسکراہٹ اور ویسا ہی ریشمی لباس۔

میں نے آنکھیں میچ لیں۔ سر جھٹکا' پھر آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

جو

وہی تھی

اور

اشفاق صاحب سے بڑے دلفریب اور شائستہ لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں پہلو میں کھڑی انیسہ نے پھر کہنی مار کر آہستگی سے تہذیبی لہجے میں کہا۔

''پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔'' میں بڑبڑایا۔ ''انیسہ! مجھے یہاں سے لے چلو۔''

''کہاں؟'' وہ میرے جسم کی کپکپاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے گھبرائی۔

''گھر''

''کیوں؟''

''بس لے چلو ورنہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔''

''ہائے اللہ'' انیسہ نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لوگوں کے جھمگٹے سے نکال کر کھلی جگہ پر لے آئی۔

''کیا بات ہے؟'' میری پشت پر سے آواز آئی۔ یہ وہی آواز تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو رابعہ کے ساتھ ملیحہ کھڑی تھی۔ اسی نے پوچھا تھا اور وہی بڑی رسانیت سے مسکرا بھی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شوخ سی چمک تھی۔

اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں بول رہی ہوں' کہہ رہی ہوں' پوچھ رہی ہوں کہ ''مجھے پہچانا؟''

ہوسکتا ہے یہ میرا واہمہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ اور خوفزدہ ہو کر میں نے یہ بات محسوس کی ہو۔

لیکن

وہ تھی

ہو بہو وہی

آنکھیں' بال' ناک نقشہ

قدوقامت

مسکراہٹ

اور مسحور کن آواز

سب کچھ ویسا ہی تھا

لیکن

یہ لڑکی یقیناً وہ نہیں تھی۔ یہ رابعہ کی بہن تھی اور سردار فرزند علی خان کی بیٹی' جو بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے گئی ہوئی تھی اور اب واپس لوٹی تھی۔ یہ جنات کے قبیلے سے نہیں تھی۔ وہ مدیحہ تھی۔

لیکن

اس مدیحہ نے اس ملیحہ کا روپ کیوں دھارا تھا؟

میں جان نہیں پایا۔

اور

آج

جب اس واقعے کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ میرا قد قدرے خم ہو گیا ہے' چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں اور بال سفید ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔میں اس واقعہ کو بھلا نہیں پایا۔

اور

نہ ہی

یہ معمہ حل کر سکا ہوں کہ اس جنات کے قبیلے سے تعلق رکھنے والی مدیحہ نے ملیحہ کا ہی روپ کیوں دھارا تھا۔

◆◆◆